قیمت چار روپے

اُردو کا پہلا بین الاقوامی ہفت روزہ

یوروپ میں
اسلامی انقلاب کا آغاز

اس شمارے میں

بوسنیا میں

AUSTRALIA	A$ 3.50	DENMARK	D. KR. 14.00	ITALY	LIT. 3,000	NEW ZEALAND	NZ$ 4.95	SRI LANKA	Rs 40
BANGLADESH	Taka 20	FRANCE	Fr 10	JAPAN		NORWAY	N. KR 12.00	SWEDEN	Kr 15
BELGIUM	Fr 70	FINLAND	F. MK 10.00	KOREA	W 1.800	PAKISTAN	Rs. 15	SWITZERLAND	Fr 3
BRUNEI	B$ 4.50	GERMANY	DM3.50	MALAYSIA	RM 3.00	PHILIPPINES	P 25	THAILAND	B 40
CANADA	C$.3.50	HONG KONG	HK$ 15.00	MALDIVES	Rf 12.00	SAUDI ARABIA	SR 3	U.K.	£ 1.30
CHINA	RMB 12.50	INDONESIA	RP 3,400 (INC.PNN)	NETHERLANDS	G 3.30	SINGAPORE	S$ 2.50	U.S.A.	US $ 3.00

ضلع پریشد الیکشن میں سماجوادی پارٹی کی جیت اور بی ایس پی کی شکست سے کانشی رام بوکھلا اٹھے

کیا ملائم حکومت چند دن کی مہمان ہے؟

کانشی رام کی تلون مزاجی ایک بار پھر اپنے جوہر دکھا رہی ہے ۔ وہ ایک بار پھر اپنے شریک اقتدار ملائم سنگھ سے خفا ہوگئے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اس بار ذرا زیادہ ناراض ہیں اور وہ ملائم سنگھ کو سبق سکھانا چاہ رہے ہیں جس کی بنا پر اترپردیش کی سیاسی صورت حال غیر یقینی اور ملائم حکومت عدم استحکام کی شکار ہوگئی ہے ۔ آج کل وہ اتنے اکھڑے ہوئے ہیں کہ کسی سے سلیقے سے گفتگو تک نہیں کرپار ہے ہیں ، یہاں تک کہ گذشتہ دنوں پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں وہ بی جے پی کے ایک رکن سے لڑ پڑے اور سابق وزیر اعظم چندر شیکھر کی مداخلت پر ہی معاملہ دب سکا۔

بہر حال یہ تو جگ ظاہر ہے کہ ملائم اور کانشی رام کی دوستی مصلحت اور ضرورت کے تحت ہے ۔ بی جے پی کو اقتدار میں آنے سے روکنے کے لئے دونوں میں انتخابی تال میل اور مشترکہ حکومت سازی کا معاملہ طے ہوا تھا ۔ لیکن کانشی رام ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش میں رہے ہیں اور ملائم سنگھ ان سے بھی زیادہ چالاکی دکھاتے رہے ہیں ۔ ملائم سنگھ چونکہ وزیر اعلیٰ ہیں اس لئے ٹھوس فائدہ اٹھانے میں وہ بازی مارلے جارہے ہیں ، کانشی رام چونکہ ملائم کا ہاتھ پکڑ نہیں سکتے اس لئے ان کے پاس صرف ایک ہی کام رہ گیا ہے ۔ ملائم کو برسر عام رسوا اور بے عزت کرنا ، ان کی تضحیک و تذلیل کرنا اور یہ دکھانا کہ اقتدار کی چابی ان کے ہاتھ میں ہے ، ملائم تمام رسوائیوں اور ذلتوں کو برداشت کرتے رہے ۔ کانشی رام کے بھی ناز اٹھاتے رہے اور مایاوتی کے بھی ، لیکن اندرون خانہ اپنی سیاسی طاقت میں اضافہ کرتے رہے ، یہاں تک کہ بی جے پی اور جنتادل کے کئی ممبران اسمبلی کو اپنے پالے میں کرلیا ، سیاسی مبصرین کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ بی ایس پی کے کئی ممبران بھی ملائم کی پارٹی میں شمولیت کے لئے پر تول رہے ہیں البتہ کسی مناسب موقع کا انتظار

ہے کانشی رام ان حقائق سے بے خبر ہوں ، ایسا نہیں ہے ، انہیں خوب معلوم ہے کہ ملائم کیا کر رہے ہیں اور ان کی سیاسی طاقت میں کتنا اضافہ ہوگیا ہے اور خود کانشی رام کتنے کمزور ہوگئے ہیں ، اسی لئے انہوں نے کئی بار ملائم کی حکومت گرانے کا فیصلہ کیا لیکن یہ انتہائی قدم اٹھانے کی جرات اس لئے نہیں ہوئی کہ ان کے ممبران اسمبلی اور وزراء اس کے لئے تیار نہیں ہیں ۔ کانشی رام کو خطرہ ہے کہ اگر انہوں نے حمایت واپس لینے کا اعلان کیا تو یہ لوگ ان کا دامن چھوڑ کر ملائم کے آغوش میں چلے جائیں گے ۔

حال ہی میں اختتام پذیر ہوئے ضلع پریشد کے انتخابات نے جلتی پر تیل کا کام کیا ، ان انتخابات میں ملائم سنگھ کی پارٹی زبردست سیاسی قوت کی حیثیت سے ابھری ہے ، ضلع پریشد چیرمین کی کل 56 نشستیں ہیں جن میں بہوجن سماج پارٹی نے 17 امیدوار کھڑے کئے تھے ۔ لیکن اس کا صرف ایک امیدوار بجنور میں کامیاب ہوا جبکہ سماجوادی پارٹی نے 29 نشستیں حاصل کیں ، بی جے پی کو 9 سیٹیں ملیں اور کانگریس کو آٹھ ۔ جنتادل کو ایک بھی سیٹ حاصل نہ ہوسکی ، کانشی رام کا خیال ہے کہ ملائم سنگھ کی حکمت عملی کے نتیجے میں ایسا ہوا ہے ورنہ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ بی ایس پی کا ایک امیدوار جیتے اور سماجوادی کے 29 جیتیں ۔ دوسری طرف لکھنؤ میں بی ایس پی کی ضلع پریشد چیرمین کی امیدوار تارا دیوی کا سماجوادی کے ایک ممبر اسمبلی راجیندر سنگھ یادو نے اغوا کرلیا تھا ، کانشی رام کا خیال ہے اغوا اور ان کی پارٹی کی خراب کارکردگی میں ملائم سنگھ کا ہاتھ ہے ، اس خیال نے ان کے غصے میں بے پناہ اضافہ کردیا۔

کانشی رام انتہائی غصے کے عالم میں لکھنؤ گئے اور تین مقامی اخباری نامہ نگاروں کو بلوا کر ملائم کو پیغام بھجوادیا ، ملائم جب وہاں پہنچے تو دروازے پر بی ایس پی کے لیڈر جنگ بہادر پٹیل ملے ، انہوں نے کہا کہ " صاحب کا موڈ بہت خراب ہے وہ کچھ بھی کرسکتے ہیں " ملائم اندر گئے تو کانشی رام نے نامہ نگاروں کے سامنے گفتگو کرنے اور بی ایس پی کی خراب کارکردگی پر ان سے وضاحت چاہنے کی ضد کی ، ملائم سنگھ کا کہنا تھا کہ وہ اخباری نامہ نگاروں کے سامنے نہیں تنہائی میں گفتگو کریں گے ۔ اس پر کانشی رام نے برافروختگی کے عالم میں ملائم سنگھ کو وہاں سے چلے جانے کو کہہ دیا ، اسی دن ضمنی الیکشن کے عوامی جلسوں میں دونوں کو مشترکہ طور پر شرکت کرنی تھی لیکن کانشی رام نہیں گئے ۔ اس وقت ایسا محسوس ہورہا تھا کہ بس اب ملائم حکومت چند لمحوں کی مہمان ہے ۔

کانشی رام اگلا الیکشن سماج وادی پارٹی کے ساتھ نہیں بلکہ جنتادل کے ساتھ لڑیں گے۔

لیکن شام کو کانشی رام نے اعلان کیا کہ وہ ملائم سے خوش تو نہیں ہیں لیکن ان کی حکومت بھی نہیں گرائیں گے ، کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں بی جے پی اقتدار میں آجائے گی ، ان حالات میں وہ دہلی واپس آگئے اور یہاں انہوں نے دوسری سرگرمی شروع کردی ، اب ان کا خیال ملائم کے بجائے جنتادل کو ساتھ لے کر چلنے کا ہے ، وہ جنتادل کے لیڈروں سے برابر رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں ۔ بہار کے وزیراعلیٰ لالو یادو اور کرناٹک کے وزیر اعلیٰ دیوگوڑا سمیت وہ کئی لیڈروں سے مذاکرات کرچکے ہیں ان میں ریاستی جنتادل کے صدر رام آسرے ورما بھی شامل ہیں ، یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وی پی سنگھ سے بھی ان کی گفتگو ہوئی ہے ، اور پہلے جہاں وی پی سنگھ کو وہ منووادی اور برہمن وادی کہتے تھے اب انہیں اپنا قریبی دوست کہہ رہے ہیں ۔

جنتادل کے لیڈران بھی ملائم سنگھ سے خار کھائے بیٹھے ہیں ، 1993ء کے اسمبلی الیکشن میں جنتا دل نے بارہ فیصد ووٹ حاصل کرکے 27 نشستیں جیتی تھیں لیکن اب اس کے ممبران اسمبلی کی تعداد محض تین رہ گئی ہے ، بقیہ سبھی سماجوادی میں شامل ہوگئے ہیں ، بی ایس پی کی مانند جنتا دل والے بھی ملائم کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں اس لئے یہ لوگ مل کر کوئی ایسی حکمت عملی ترتیب دینے میں مصروف ہیں جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے ، یعنی ملائم کی حکومت ختم ہوجائے مگر بی جے پی اقتدار میں نہ آنے پائے ، 1996ء کے جنرل الیکشن کے پیش نظر بھی دونوں پارٹیوں کے لیڈروں میں مذاکرات ہورہے ہیں 96 کا الیکشن کانشی رام ملائم کے ساتھ نہیں لالو کے ساتھ لڑنا چاہتے ہیں ، شرد یادو اس صورت حال سے زبردست جوش و خروش میں ہیں وہ ابھی تک یہ نہیں بھولے ہیں کہ بدایوں میں ملائم نے انہیں شکست دلوادی تھی ، لیکن رام ولاس پاسوان اس صورت حال سے خوش نہیں ہیں کیونکہ جنتا دل میں ابھی تک وہی دلتوں اور پسماندہ طبقات کے لیڈر تھے ، کانشی رام کے آنے سے ان کا وزن کم ہوجائے گا ، لیکن مجموعی طور پر جنتادل بھی وہی چاہ رہا ہے جو کانشی رام چاہتے ہیں ادھر سماجوادی پارٹی بھی ان امور پر میٹنگس کررہی ہے ۔ صورت حال انتہائی غیر یقینی اور پیچیدہ ہوگئی ہے ۔ ایسے حالات میں اگر کانشی رام اپنی حمایت واپس لے لیتے ہیں تو تعجب نہیں ہونا چاہئے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ ملائم ان حالات سے کیسے نمٹتے ہیں۔

کشمیر میں پوچھ تاچھ کے نام پر لرزہ خیز مظالم کا لامتناہی سلسلہ

مرد اپنی جنسی صلاحیتوں سے محروم ہورہے ہیں

انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر اسٹڈیز سرینگر کے فردوسی عاصمی کی رپورٹ

وادی کشمیر میں انسانی حقوق کی سنگین صورت حال کا مسئلہ بڑی حد تک پس منظر میں چلا گیا ہے گورنر کی انتظامیہ چرار شریف کے سانحہ ، ریاستی الیکشن کے انعقاد اور ملازمین کی اپنے 78 ساتھیوں کی برطرفی کے خلاف جنوری سے جاری احتجاجی ہڑتال جیسے مسائل میں بری طرح الجھی ہوئی ہے ۔ وہیں دوسری طرف

صحافیوں اور حقوق انسانی کی تنظیموں میں انسانی حقوق کی پامالی کا پتہ لگانے کے تئیں پہلے جیسا جوش و خروش نظر نہیں آتا۔

اگرچہ وادی کے شہری علاقوں میں سیکورٹی فورسیز نے فوجی محاصرے اور تلاشی (کریک ڈاؤن) کی روزمرہ کارروائیوں کی تعداد کم کردی ہے مگر دیہی علاقوں میں یہ کارروائیاں بے روک ٹوک جاری ہیں ۔ چونکہ سول اور پولیس حکام فوج کی ان کارروائیوں میں کوئی مداخلت نہیں کرتے ہیں اس لئے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا مشکل سے ہی کوئی معاملہ سامنے آتا ہے علاوہ ازیں پولیس محکمہ نے وادی میں اپنے سارے تھانوں اور چوکیوں کو یہ ہدایت کردی ہے کہ لوگوں کی شکایت کے باوجود سیکورٹی عملے کے خلاف فوجداری کے مقدمے درج نہ کئے جائیں ۔ اس کے نتیجے میں نیم فوجی دستوں کے حوصلے کافی بلند ہوگئے ہیں ۔ اخباری نمائندوں کا دائرہ کار بھی دارالحکومت سری نگر تک محدود ہے اس طرح سلامتی دستوں کو کھل کھیلنے کا موقع مل رہا ہے ۔

گذشتہ دنوں سرحدی ضلع کپواڑہ کے رنگور نو گاؤں کی 35 سالہ خاتون حفیظہ شفیع اپنی چار بیٹیوں کے ہمراہ اخباری نمائندوں سے ملنے کے لئے سری نگر پہنچی یہ چھوٹا سا گاؤں یہاں سے 87 کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اس مظلوم خاتون نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ " اس کا شوہر ایک مجاہد ہے ۔ 6 مارچ کو راشٹریہ رائفلز (RR) کے دستے نے ان کے گاؤں کا محاصرہ کرلیا اور تلاشی کی کاروائی شروع کردی ۔ اس دوران چند فوجی افسران مجھے اور میری بہو سارہ کو گھسیٹ کر ایک سنسان کمرے میں لے گئے جہاں وہ بار بار ہماری عصمت سے کھیلتے رہے ۔ میں نے اس واقعہ کی پولیس میں شکایت کی لیکن انہوں نے یہ معاملہ درج کرنے سے انکار کردیا ۔ پولیس کے اس رویہ سے حوصلہ پاکر یہ افسران بار بار ہمارے گھر آنے لگے اور تلاشی کے نام پر وہ ہمارے گھر میں زبردستی رک جاتے اور اس دوران ہمارے ساتھ " وحشیانہ حرکتیں " کرتے ۔ یہ کہتے ہوئے حفیظہ کی

راشٹریہ رائفلز کے دستے نے ان کے گاؤں کا محاصرہ کرلیا اور تلاشی کی کاروائی شروع کردی ۔ اس دوران چند فوجی افسران مجھے اور میری بہو سرہ کو گھسیٹ کر ایک سنسان کمرے میں لے گئے جہاں وہ بار بار ہماری عصمت سے کھیلتے رہے

بقیہ صفحہ 10 پر

بی جے پی سے سازباز کرکے ملائم حکومت گرانے کا کھیل

سیکولر عوام کی پشت میں کانشی رام اور مایاوتی کا خنجر

بالآخر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ کانشی رام نے ملائم سنگھ یادو حکومت سے اپنی حمایت واپس لے لی اور اترپردیش میں ایک سیاسی بحران کھڑا کر دیا۔ یہ حکومت اپنی پیدائش کے پہلے دن سے ہی انتہائی غیر مستحکم اور کمزور تھی۔ کیونکہ اس مشترکہ حکومت کے سینے میں جو دل تھا اس میں بہوجن سماج پارٹی کا پیس میکر نصب تھا اب کانشی رام نے وہ آلہ نکال لیا اور ایس پی۔ بی ایس پی حکومت اپنے انجام کو پہنچ گئی

ادھر ایک دو ہفتے سے اترپردیش کے سیاسی حالات انتہائی دھماکہ خیز اور ڈرامائی ہوگئے تھے۔ کانشی رام اور مایاوتی کا غصہ ساتویں آسمان پر تھا، وجہ یہ تھی کہ ملائم سنگھ اپنی سیاسی زمین مستحکم کرنے میں مصروف تھے، جس سے بی ایس پی کی زمین کمزور ہورہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بھی کانشی رام کے ہتک آمیز رویے اور مسلسل بلیک میلنگ سے تنگ آگئے تھے اور اس بیساکھی سے نجات چاہتے تھے۔ دریں اثنا ضلع پریشد کے انتخابات ہوئے اور ان میں بی ایس پی کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ان انتخابات میں ملائم نے ہر ممکن کوشش کرکے اپنے امیدواروں کو جتایا اور بی ایس پی کے امیدواروں کو ہرایا۔ جس کی بنا پر کانشی رام نے ملائم کو دی جانے والی حمایت واپس لینے کا فیصلہ کرلیا (اس کی تفصیل صفحہ دو پر شائع ایک رپورٹ سے معلوم ہوجائے گی)

بہرحال یہ انتہائی قدم اٹھانے سے قبل کانشی رام نے اپنے سب سے بڑے سیاسی حریف بی جے پی کے لیڈروں سے گفت وشنید کی، اڈوانی سے بھی ملے اور جنتادل کے لیڈروں سے بھی۔ بی ایس پی کے راجیہ سبھا کے رکن صنعت کار جینت ملہوترہ نے اس سلسلے میں اہم "خدمات" انجام دیں، انہوں نے مرلی منوہر جوشی اور واجپئی سے جوشی کے گھر پر گفتگو کی ان کے علاوہ ارجن سنگھ، جتیندر پرشاد، دیوگوڑا، لالو پرشاد یادو، کلراج مشرا اور کلیان سنگھ سے بھی گفت وشنید کی گئی۔ کانشی رام نے انتہائی بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ونے کٹیار سے بھی گفتگو کی، کٹیار نے ملائم حکومت سے حمایت واپس لے کر بی جے پی کے ساتھ آنے کی پیش کش کی۔ کانشی رام، مایاوتی اور جینت ملہوترہ کی کوششیں رنگ لائیں اور بی جے پی نے جو پہلے سے ہی اس تاک میں تھی بی ایس پی کو غیر مشروط طور پر حمایت دینے کا اعلان کردیا۔ بی ایس پی ذرائع کے

> بی ایس پی کے لیڈر راج بہادر نے بارہ ممبران اسمبلی کے ساتھ گورنر سے ملاقات کی ہے اور ملائم حکومت کو اپنی حمایت دینے کا وعدہ اور اپنے گروپ کے اصلی بی ایس پی ہونے کا دعوی کیا ہے۔

رپورٹ: سہیل انجم

مطابق جنتادل اور کمیونسٹ پارٹیوں نے بھی حمایت دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن بعد میں جنتادل اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اعلان کیا کہ وہ کسی ایسی حکومت کو سپورٹ نہیں کریں گے جسے بی جے پی کی حمایت حاصل ہو۔

اس وقت جب کہ اخبار پریس میں جاچکا ہے اور یہ آخری کاپی بھی جانے والی ہے، صورت حال مبہم اور غیر واضح ہے، کانشی رام کے دستخط سے جاری کیا گیا خط گورنر کے پاس ہے جس میں حمایت واپس لینے اور حکومت سازی کا دعوی کیا گیا ہے، مایاوتی کہتی ہیں کہ بی جے پی اور دوسرے حزب اختلاف پارٹیوں کے ممبران کی تعداد کو ملاکر ان کے پاس 282 ممبران ہوجاتے ہیں اس لئے حکومت سازی کا حق انہیں کو ہے، دوسری طرف ملائم سنگھ کا کہنا ہے کہ میں نہ تو استعفی دوں گا اور نہ ہی وسط مدتی انتخاب کرانے کی سفارش کروں گا میں 8 جون کو اسمبلی میں اپنی اکثریت ثابت کروں گا، حالات کیا موڑ لیں گے اس کا فیصلہ ایک دو دن میں ہوجائے گا۔

حمایت واپس لیتے ہی کانشی رام اسپتال میں داخل، جینت ملہوترا کو سیاسی چالیں سمجھاتے ہوئے اور انسیٹ میں مایاوتی اور ملائم سنگھ یادو

کانشی رام کا جہاں تک تعلق ہے وہ ہمیشہ مسلمانوں کی نظروں میں غیر معتبر رہے ہیں، انہوں نے دلتوں اور مسلمانوں کا جھنڈا بلند کرکے اپنی سیاسی زمین مضبوط کی ہے لیکن وہ نہ تو دلتوں کے سچے ہمدرد رہے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کے۔ مسلمانوں کے تعلق سے ان کی ذہنیت آر ایس ایس اور شیوسینا کی ذہنیت سے ملتی جلتی ہے۔ وہ کئی بار مسلمانوں کو مغلظات سنا چکے ہیں، بال ٹھاکرے کے اس بیان کی بھی انہوں نے تائید کی تھی جس میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو کنٹرول کرنے اور بنگلہ دیشی مسلمانوں کو ہندوستان سے بھگانے کی بات کہی گئی تھی۔ ادھر مایاوتی اکثر مسلمانوں کو دھوکے باز اور غدار جیسے القاب سے نوازتی رہی ہیں۔ سیاسی ابن الوقتی کا یہ کتنا بے شرمانہ مظاہرہ ہے کہ وہ کانشی رام جو بی جے پی کو گالیاں دیتے نہیں تھکتے تھے اور جن کی سیاست کی عمارت ہی اونچی ذات کی مخالفت پر قائم تھی، اسی اونچی ذات والوں کی پارٹی کی حمایت سے آج حکومت بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ بی جے پی اسی موقع کی منتظر تھی۔ اسے ملائم سنگھ کے ساتھ ساتھ کانشی رام سے بھی انتقام لینا ہے۔ اس نے دراصل ایک تیر سے کئی شکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک تو وہ پسماندہ طبقات کے فرنٹ کو کمزور کرکے ملائم کو اقتدار سے بے دخل کرنا چاہتی ہے دوسرے کانشی رام کی حمایت کرکے آگے چل کر ان کی سیاسی قوت کو بھی خاتمہ کرنا چاہتی ہے۔ اس وقت اترپردیش کی سیاسی فضا انتہائی مبہم، غیر واضح اور گڈمڈ ہے۔ گورنر کا کیا قدم ہو یہ فیصلہ کرے گا کہ اترپردیش میں سیکولر اقتدار کو تقویت حاصل ہوگی یا ایک بار پھر فرقہ پرست قوتوں کو عروج حاصل ہوگا۔

مغرب کے خونخوار حکمرانوں کے ذہن پر یہ بات حاوی ہے کہ

بوسنیا میں دراصل صلیب اور ہلال کی جنگ لڑی جارہی ہے

تین سال قبل بوسنیا ہرزیگوینا کے اعلان آزادی کے بعد عیسائی سربوں نے بوسنیائی مسلمانوں کے خلاف جس بہیمانہ جنگ کا آغاز کیا تھا وہ اب اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے۔ مسئلے کی اصل نوعیت کو سمجھنے کے لئے اس جنگ کے پس منظر پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

جب یوگوسلاویہ سے کمیونزم کا جنازہ نکلا تو اس کی مختلف ریاستوں یا قومیتوں نے آزادی کا اعلان کردیا پہلے سربیا اور پھر کروشیا نے آزادی کا اعلان کیا اور انہیں مغرب نے تسلیم بھی کرلیا۔ مگر جب بوسنیا نے ایک آزاد ریاست ہونے کا اعلان کیا تو ایک طرف مغرب نے اسے تسلیم کرنے میں پس وپیش کا رویہ اختیار کیا تو دوسری طرف سربوں نے اس نوآزاد شدہ ریاست کے خلاف وحشت ناک جنگ چھیڑ دی۔

بوسنیا ہرزیگوینا دراصل ایک مسلم اکثریتی ریاست ہے۔ آزادی کے وقت یہاں سب سے زیادہ مسلمان یعنی تقریباً پچاس فیصد، سرب تیس فیصد اور بقیہ کروشیائی نسل کے لوگ تھے۔ چونکہ مسلمان واحد اکثریتی فرقہ تھے اس لئے یورپ نے سوچا کہ اس طرح البانیہ کے بعد اس کے قلب میں ایک دوسری مسلم ریاست قائم ہوجائے گی۔ مزید براں فوجی نقطہ نظر سے بوسنیا البانیہ کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ نے تو بوسنیا کی آزادی کی مخالفت نہیں کی لیکن دل سے وہ اسے تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوا۔ چنانچہ ان کے اس رویے سے شہ پاکر سربیا کی مدد سے بوسنیا میں رہنے والے سربوں نے مسلم اکثریتی حکومت کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔

واضح رہے کہ بوسنیائی مسلمانوں کو سابق یوگوسلاویہ کی فوج سے عمداً الگ رکھا گیا تھا۔ چونکہ ترکوں کی حکومت میں بوسنیائی مسلمانوں کو اہم پوزیشن حاصل تھی اس لئے ان سے آزادی کے بعد یوگوسلاویہ نے کبھی ان پر پورے طور پر اعتماد نہیں کیا۔ ان کی بہ نسبت سرب نسل کے لوگ پوری طرح فوج پر حاوی تھے۔ چنانچہ جب جنگ شروع ہوئی تو ٹریننگ اور ہتھیار کے اعتبار سے انہیں بوسنیائی مسلمانوں پر مکمل برتری حاصل تھی جس کا انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

جنگ شروع ہوتے ہی اہل مغرب نے بھی بڑی چالاکی سے اپنی صلیبی ذہنیت کا مظاہرہ کرنا شروع کردیا۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے خاص طور سے برطانیہ اور فرانس نے اقوام متحدہ کے ذریعہ یہ پابندی لگوادی کہ فریقین کو کوئی ہتھیار نہیں دے گا۔ ظاہر ہے اس کا مقصد جنگ میں سربوں کی برتری کو یقینی بنانا تھا، اس پابندی کے بعد پہلے ہی سے نہتے بوسنیائی مسلمان مزید کمزور ہوگئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جنگ ہارتے گئے اور بوسنیا وہرزیگوینا کے 70 فیصد حصہ پر سربوں نے قبضہ کرلیا۔

اس جنگ کے دوران سربوں نے بوسنیائی مسلمانوں کے ساتھ بڑا وحشیانہ سلوک کیا، وہ امن سے رہنے والے مسلمانوں کو مقبوضہ علاقوں سے بھگانا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے دو خطرناک قسم کی پالیسی اختیار کی۔ اول مردوں اور بچوں کا قتل عام اور دوسرے عورتوں کے ساتھ اجتماعی زناکاری تاکہ وہ خوف زدہ ہوکر اپنے گاؤں اور کھیتوں سے بھاگ جائیں۔

مہذب دنیا میں نازی جرمنوں کے جرم سے بھی زیادہ بھیانک یہ جرم جاری رہا۔ مسلم حکمراں عادتاً بیان بازی میں مصروف رہے، لیکن جب ان کے عوام میں غصہ بڑھا تو انہوں نے امریکہ بہادر سے کچھ کرنے کو کہا۔ دریں اثنا عورتوں کے خلاف مظالم دیکھ کر یورپ و امریکہ کی حقوق انسانی کی تنظیمیں خصوصاً خواتین بھی سرگرم ہوگئیں جس کی وجہ سے مغربی حکومتوں کو بھی کچھ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

مغربی حکومتیں تو چاہتی تھیں کہ بوسنیا آزاد حکومت نہ بن سکے۔ لیکن سربوں کی بربریت کی وجہ سے جب ان کے اپنے عوام ان کی نااہلی پر برہم ہونے لگے تو انہوں نے دو کام کیا۔ اول یہ کہ بوسنیا کو تین حصوں میں بانٹ کر اس کا بڑا حصہ سربیا کو، ایک حصہ کروشیا اور تیسرا حصہ بوسنیا کو دے دیا دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ بعض ان علاقوں کو جہاں مسلمان ادھر ادھر سے بھاگ کر پناہ لئے ہوئے تھے انہیں اقوام متحدہ کی نگرانی میں نیوٹرل زون بنا دیا اور وہاں اپنی فوجیں روانہ کردیں۔ ان میں زیادہ تر برطانیہ اور فرانس کی فوجیں ہیں۔

یوروپ اب تک سربوں کی جارحیت کو برداشت کرتا رہا ہے جس کے نتیجہ میں وہ شیر ہوگئے ہیں۔ وہ کسی طرح مسلمانوں کی ایک چھوٹی آزاد ریاست کو بھی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں، چنانچہ وہ کسی نہ کسی بہانے سے بوسنیا کو تین حصوں میں بانٹنے کے فارمولے کو تسلیم کرنے سے کتراتے رہے ہیں۔ حال ہی میں جب مغرب نے زیادہ دباؤ ڈالا تو انہوں نے دوبارہ جنگ شروع کردی اور صرف آزاد بوسنیا کے دارالحکومت سراجیوو ہی پر نہیں بلکہ بیہاج اور ان دوسرے شہروں پر بھی حملہ کردیا جنہیں اقوام متحدہ کے تحت "امن علاقہ" قرار دے دیا گیا ہے اور جہاں نگراں کے طور پر برطانیہ و فرانس وغیرہ کی فوجیں تعینات ہیں۔

سربوں کی اپنے خلاف جارحیت کو روکنے کے لئے ناٹو کے جہازوں نے سربیائی ٹھکانوں پر بمباری کی جس کے بعد سربوں نے برطانیہ و فرانس کی فوجوں کو یرغمال بنالیا۔ ان کے ہتھیار چھین لئے اور انہیں دست بستہ ان جگہوں پر "انسانی حفاظت گاہ" کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا جہاں انہیں اندیشہ تھا کہ مغرب کے طیارے حملہ کرسکتے ہیں۔

اس غیر انسانی واقعے کے بعد مغرب کی قیادت کافی برہم ہے۔ پہلی بار امریکہ نے کہا ہے کہ وہ ان فوجیوں کو سربوں سے چھڑانے کے لئے فوجی کارروائی میں حصہ لے سکتا ہے۔ برطانوی وزیراعظم جان میجر، فرانسیسی صدر اور روسی وزیر خارجہ نے بھی سخت بیانات دیے ہیں۔ لیکن بظاہر سربوں پر ان کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ اقوام متحدہ کے فوجیوں کو اب بھی یرغمال بنائے ہوئے ہیں اور معلوم یہ پڑتا ہے کہ مغرب سربوں سے جھک کر کوئی سمجھوتہ کرلے گا۔ ظاہر ہے اس سے ان کے اپنے فوجی تو چھوٹ جائیں گے اور شاید اس کے بعد وہ انہیں واپس بھی بلالیں۔ تاکہ سرب اس صلیبی پلان کو پایہ تکمیل تک پہنچادیں جس کا مقصد بوسنیائی مسلم ریاست کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا ہے اور جس میں اہل مغرب خفیہ طور پر خود بھی شریک ہیں۔

رابن حکومت تو بچ گئی مگر کیا

عرب زمینوں کو ہڑپنے کا سلسلہ کبھی ختم بھی ہوگا

گذشتہ دنوں اسرائیلی حکومت نے اپنے اس حکم کو سردست ملتوی کردیا ہے جس کے مطابق مشرقی یروشلم جہاں عربوں کی آبادی و زمین ہے ۔کی 131 ایکڑ زمین کو سرکاری ملکیت میں لے کر وہاں پر یہودیوں کے لئے مکانات کی تعمیر کی جانی تھی۔ اسرائیلی حکومت نے یہ فیصلہ اس لئے لیا کہ کو اس کے خلاف دو عدم اعتماد کی تحریکوں پر ووٹ ڈالے جانے تھے۔ ایک تحریک دائیں بازو سے تعلق والی یہودی جماعتوں اور دوسری تحریک عدم اعتماد پارلیمانٹ کے پانچ عرب اراکین نے پیش کی تھی۔ رابن حکومت کی بقا کے لئے ان پانچ عرب اراکین کی حمایت ضروری تھی۔ عرب زمین کو سرکاری ملکیت میں لینے کے فیصلے کو ملتوی کرکے رابن نے گویا عرب اراکین کی حمایت دوبارہ حاصل کرلی۔ چنانچہ ان ممبروں نے اپنی تحریک واپس لے لی لیکن یہودی جماعتوں کی پیش کردہ تحریک عدم اعتماد پر ووٹنگ ہوئی اور اسے شکست بھی ہوگئی۔ اس طرح رابن حکومت گرنے سے بچ گئی۔

بے گھر بے سہارا فلسطینی خواتین امت مسلمہ سے سوالی ہیں؟

جائیں تو جائیں کہاں؟ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

رابن حکومت کے فیصلے سے بظاہر وہ بحران سردست ختم ہوتا نظر آرہا ہے جو 27 اپریل کے سرکاری فیصلے سے پیدا ہوگیا تھا۔ امریکہ نے اس پر خوشی کا اظہار کیا ہے جبکہ بعض دوسرے ممالک نے محتاط انداز میں اس کا استقبال کیا ہے۔ واضح رہے کہ عرب اراضی کو ہتھیانے کے اسرائیلی فیصلے پر اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں زبردست بحث ہوئی تھی اور اسرائیل کے خلاف ایک مذمتی قرارداد کو ۔جسے 15 میں سے 14 ممبروں کی حمایت حاصل تھی ۔امریکہ نے ویٹو کردیا تھا۔ اسرائیلی فیصلے اور امریکی ویٹو کے بعد پی ایل او — اسرائیل امن معاہدہ پر خطرات کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ یاسر عرفات پر زبردست دباؤ تھا کہ وہ اسرائیل کے ساتھ جاری مذاکرات کو ملتوی کردیں مگر ظاہر ہے یہ ان کے لئے مشکل تھا۔ چنانچہ اس زبردست دباؤ کے باوجود انہوں نے مذاکرات ختم نہ کرنے کا فیصلہ کیا

1947ء میں تقسیم فلسطین کی تجویز میں یروشلم مجوزہ اسرائیل کا حصہ نہیں تھا۔ لیکن 1948ء کی جنگ میں اس نے مغربی یروشلم پر قبضہ کرلیا۔ شہر کی عرب آبادی والا حصہ یعنی مشرقی یروشلم اردن کے قبضہ میں آگیا۔ لیکن اسے چند گنے چنے ممالک نے ہی تسلیم کیا ہے۔ حال ہی میں امریکہ کی ریپبلکن پارٹی نے کانگریس میں ایک بل پیش کرکے مطالبہ کیا ہے کہ امریکہ تل ابیب سے اپنا سفارتخانہ یروشلم منتقل کردے۔ مگر پی ایل او اور دوسرے عرب ممالک متوقع طور پر اس کی زبردست مخالفت کر رہے ہیں۔ ستمبر 1993ء میں دستخط کئے گئے پی ایل او — اسرائیل معاہدے

عرب اسرائیل معاہدے کے مطابق یروشلم کی حتمی حیثیت کے بارے میں مذاکرات مئی 1996 سے پہلے نہیں ہوسکتے۔ اسرائیل اس تاریخ کے آنے سے قبل ہی یروشلم کے آس پاس کی باقی ماندہ عرب زمین ہڑپ کرکے اور وہاں پر یہودی بستیاں بساکر پی ایل او کے اس مطالبے سے ہوا نکال دینا چاہتا ہے کہ مشرقی یروشلم کو مستقبل کی فلسطینی ریاست کا دارالحکومت ہونا چاہیے۔

کے مطابق یروشلم کی حتمی حیثیت کے بارے میں مذاکرات مئی 1996ء سے پہلے نہیں ہوسکتے۔ اسرائیل اس تاریخ کے آنے سے قبل ہی یروشلم کے آس پاس کی باقی ماندہ عرب زمین ہڑپ کرکے اور وہاں پر یہودی بستیاں بساکر پی ایل او کے اس مطالبے سے ہوا نکال دینا چاہتا ہے کہ مشرقی یروشلم کو مستقبل کی فلسطینی ریاست کا دارالحکومت ہونا چاہیے۔

1967ء میں مشرقی یروشلم پر قبضے کے بعد سے اسرائیل مسلسل عرب ملکیت والی زمینوں کو جبرا سرکاری تحویل میں لے کر وہاں یہودیوں کو بسا رہا ہے۔ اقوام متحدہ کی ایک قرارداد کے مطابق مشرقی یروشلم مقبوضہ علاقہ ہے جس کی شکل کسی صورت میں بدلی نہیں جاسکتی۔ مگر امریکہ کی حمایت سے

1967ء کے بعد بھی مسلسل 13 سال تک عرب زمینوں پر اسرائیل جبرا قبضہ کرتا رہا اور وہاں یہودی آبادیاں قائم کرتا رہا لیکن اقوام متحدہ اسے اس سے باز نہ رکھ سکا۔ چنانچہ آج پورے یروشلم کا نقشہ بدل چکا ہے، پورے یروشلم میں یہودیوں کی آبادی ساڑھے چار لاکھ کے قریب ہے جبکہ عرب صرف ڈیڑھ لاکھ ہیں۔

اسرائیل نے ہمیشہ اس قرارداد کا مذاق اڑایا اور عرب زمین ہتھیاکر وہاں یہودی بستیاں بساکر شہر کا نقشہ بدلتا رہا۔

لیکن گذشتہ پندرہ سالوں سے اسرائیل نے کم از کم یروشلم میں عربوں کی زمین جبرا حاصل کرکے وہاں یہودی بستیاں قائم کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ 27 اپریل کے سرکاری حکم نامے کے مطابق دو مقامات پر واقع عرب زمینوں کو جبرا سرکاری تحویل میں لیا جانا تھا جسے سردست ملتوی کردیا گیا ہے۔ یہ دونوں مقامات اس وقت غیر آباد ہیں۔ پہلا مقام یروشلم کے شمال میں 1967ء کے بعد قائم ہونے والی یہودی آبادی راموت اور عرب علاقہ بیت حنینہ کے درمیان واقع ہے۔ اس جگہ یہودیوں کے لئے 9 سو نئے مکانات بنائے جانے کا پروگرام ہے۔ دوسری جگہ اس سے کافی چھوٹی ہے جو شہر کے جنوب میں عرب گاؤں بیت صفافہ کے نزدیک واقع ہے۔ یہاں ایک نیا پولیس اسٹیشن اور عربوں کے لئے 440 مکانات بنانے کی تجویز ہے۔ دونوں مقامات کا مجموعی رقبہ، جسے جبرا ہتھیایا جانا ہے 131 ایکڑ ہے۔

27 اپریل کے سرکاری اعلان کے بعد 30 اپریل کو حکومت کی ہاؤسنگ کمیٹی نے ایک بہت پرانے پروگرام کو مان لیا جس کے مطابق بیت اللحم روڈ پر واقع عرب گاؤں بیت سحور کے قریب صرف یہودیوں کے لئے 6500 مکانات تعمیر کئے جائیں گے۔ یہ زمین چند سال قبل جبرا سرکاری تحویل میں لی گئی تھی۔ اس کا مختصر حصہ یہودیوں کی ملکیت اور بقیہ سب عربوں کے زیر ملکیت تھا۔

جبرا تحویل میں لی گئی نئی زمینیں اس کے مقابلے میں بہت کم ہیں جو 1967ء کی فتح کے فورا بعد اسرائیل نے عربوں سے چھین لی تھی اور جہاں آج یہودی بستیاں قائم ہیں۔ 1967ء کے بعد بھی مسلسل 13 سال تک عرب زمینوں پر اسرائیل جبرا قبضہ کرتا رہا اور وہاں یہودی آبادیاں قائم کرتا رہا لیکن اقوام متحدہ اسے اس سے باز نہ رکھ سکا۔ چنانچہ آج پورے یروشلم کا نقشہ بدل چکا ہے، پورے یروشلم میں یہودیوں کی آبادی ساڑھے چار لاکھ کے قریب ہے جبکہ عرب صرف ڈیڑھ لاکھ ہیں۔ خود مقبوضہ مشرقی یروشلم میں اب یہودیوں کی تعداد عربوں سے زیادہ ہے یعنی ایک لاکھ 60 ہزار۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عربوں کو یہودیوں کے برخلاف باہر سے آکر یہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ عربوں کو کبھی نئے مکانات بنانے کی اجازت نہیں ملتی اور اگر کوئی مجبورا بغیر اجازت کے بنا لیتا ہے تو اسے ڈھا دیا جاتا ہے۔ یہ سب دراصل اس اسرائیلی پالیسی کا نتیجہ ہے جس کے مطابق وہ پورے یروشلم کو یہودی شہر اور اسرائیلی دارالحکومت بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔

—

جمیمہ گولڈ اسمتھ سے "خدائی بلے باز" عمران خاں کی شادی پر

دنیا بھر میں **تہلکہ** کیوں مچ گیا

یوروپ کی حسینائیں اسلام قبول کرنے کے لئے بے چین کیوں ہیں؟
دنیا بھر میں آج اسلام بحث کا موضوع کیوں ہے؟

جمیمہ کون ہے؟ اور کیا چاہتی ہے؟

عمران خاں کے خفیہ منصوبے کیا ہیں؟ جمیمہ کے بعد وہ اور کیا چاہتے ہیں؟
جمیمہ کے پاکستان میں داخل ہوتے ہی بے نظیر پر کیا گذرے گی؟
اہلیہ عمران جمیمہ گولڈ اسمتھ سے حائقہ خان تک؟

عمران اور جمیمہ کے تعلقات کا سفر مرحلہ در مرحلہ، لمحہ لمحہ کی تفصیلی رپورٹ۔
لندن سے نمائندہ ملی ٹائمز کا آنکھوں دیکھا حال

شادی کے بعد اب **عمران خاں** کا اگلا قدم کیا ہوگا؟

یہ سب جاننے کے لئے ملاحظہ کیجئے ملی ٹائمز کا خصوصی ضمیمہ جو انشاءاللہ اگلے شمارے کے ساتھ اسٹال پر دستیاب ہوگا۔
محرومی سے بچنے کے لئے اپنا آرڈر آج ہی بک کرائیں۔ **قیمت ۱۰ روپئے**

ایجنٹ حضرات بذریعہ اسپیڈ پوسٹ، ٹیلیفون، ٹیلیگرام، یا فاکس اپنے اضافہ شدہ آرڈر سے جلد از جلد مطلع فرمائیں

گھریلو اور بیرونی دونوں محازوں پر حکومت کی سخت ناکامی

ترکی کی وزیراعظم سیاسی بحران کے نرغے میں

ترکی کی وزیراعظم آج کل ملک کے اندر اور باہر بھی ہدف تنقید بنی ہوئی ہیں۔ ان کی موجودہ دشواریوں کا آغاز اس وقت ہوا جب تقریباً تین ماہ قبل انہوں نے 35 ہزار فوجیں عراق میں کرد باغیوں کو کچلنے کے لئے بھیج دیں۔ فوج کے ڈر سے متوقع طور پر کرد گوریلا پہاڑوں میں چھپ گئے جس سے ان کو کچلنے کا مقصد بھی پورا نہ ہوسکا۔ ہاں البتہ اس اقدام نے تانزوسیلر کی دشواریوں میں اضافہ ضرور کردیا۔

کرد باغیوں کے خلاف ترکی کی فوج کشی کی یوروپی یونین نے سخت تنقید کی تھی جس میں تانزوسیلر چاہتی ہیں کہ ہر قیمت پر ترکی کو شامل ہونا چاہئے۔ لیکن یوروپی یونین کا کہنا ہے کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ترکی اپنے یہاں انسانی حقوق میں بہتری پیدا کرے گا۔ یوروپی یونین کی تنقید سے ناراض ہوکر 27 اپریل کو کونسل آف یوروپ کی ایک میٹنگ سے ترکی احتجاجاً واک آؤٹ کرگیا تھا۔

اب بھی تقریباً چار ہزار ترک فوجی عراق میں کردوں کے خلاف کاروائی میں مصروف ہیں۔ اسے بنیاد بناکر یوروپی ممالک تانزوسیلر کو ہدف تنقید بنائے ہوئے ہیں تو دوسری طرف وزیراعظم کی اپنی پارٹی کے بعض ممبران اور بعض دوسری پارٹیاں انہیں ان قوانین کو نرم کرنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں جو دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ دراصل ترکی کے اکثر لوگ کرد باغیوں کے خلاف، یوروپی یونین کی پالیسی کے برعکس، سخت کاروائی کے حامی ہیں۔ اگر یوروپی یونین کے دباؤ کے تحت تانزوسیلر دہشت گردی مخالف قوانین میں نرمی پیدا کرتی ہیں تو پہلے ہی سے روبہ زوال ان کی مقبولیت میں مزید کمی واقع ہوجائے گی۔ دراصل تانزوسیلر کی معاشی پالیسیاں غلط ہیں جو مغرب کو کافی پسند ہیں، لیکن خود ترکی میں انتہائی غیر مقبول ہیں، کیونکہ اس سے انہیں وہ کچھ نہیں مل سکا ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے اس وجہ سے وزیراعظم کی مقبولیت خطرناک حد تک گھٹ گئی ہے۔

وزیراعظم کے حامی ترک، جو مراعات یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور جو سیکولر اور مغرب زدہ ہیں، یہ تو پسند کرتے ہیں کہ ان کا ملک یوروپ سے نہ صرف قریب ہو بلکہ اس کا ایک حصہ تصور کیا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ انہیں مغرب کی حقوق انسانی کے نام پر ترکی کے اندرونی معاملات میں مداخلت سخت ناپسند ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تجارت و سیاست میں مغرب سے نزدیکی ان کی معاشی بہتری و فلاح کے لئے ضروری ہے اور اس کے حصول کے لئے انہیں کرد باغیوں کے خلاف بنائے گئے قوانین میں نرمی پیدا کرنے جیسی قربانی دینی ہی پڑے گی۔

خود ترکی کے اندر موجود حقوق انسانی فاؤنڈیشن بھی ترک وزیراعظم کے لئے ایک مسئلہ ہے۔ یہ تنظیم "ریاستی دہشت گردی" یا حقوق انسانی کی پامالی سے متعلق وقتاً فوقتاً رپورٹیں شائع کرتی رہتی ہے۔ اب تک اس تنظیم کے مطابق 30 افراد پولیس کی حراست میں تشدد کی وجہ سے موت واقع ہوچکی ہے۔ خود پارلیامنٹ کے ایک وفد نے حال ہی میں ترک فوج کی یہ کہہ کر تنقید کی کہ وہ عراق میں قوانین کو بالائے طاق رکھ کر من مانی کر رہی ہے۔ حقوق انسانی کے علمبردار اس بات سے بھی ناراض ہیں کہ چھ ترک ممبران پارلیامنٹ کے خلاف بغاوت کے جرم میں مقدمہ چلاکر انہیں جیل بھیج دیا گیا ہے۔ اسی طرح مشہور ناول نگار یاسر کمال کے خلاف بغاوت کا مقدمہ بھی خاصا پریشان کن ہے۔ کمال کے خلاف بغاوت کا مقدمہ ایک جرمن رسالے میں چھپے ان کے ایک مضمون کی وجہ سے قائم کیا گیا ہے جس میں انہوں نے کردوں کے حقوق کی مسلسل پامالی پر حکومت کی تنقید کی ہے۔ حکومت نے اس تنقید کو ملکی سلامتی اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو خطرہ سے تعبیر کرکے کمال کے خلاف بغاوت کا مقدمہ قائم کردیا ہے۔

دراصل حکومت کو انسداد دہشت گردی قانون کی دفعہ 8 کی وجہ سے غیر محدود اختیارات حاصل ہوگئے ہیں جس کا پولیس مسلسل غلط استعمال کر رہی ہے۔ اس دفعہ کے مطابق کوئی بھی کام جس سے ملکی سلامتی پر حرف آئے، قانوناً قابل گرفت ہے۔ اسی قانون کے تحت یاسر کمال اور ایسے ہی دوسرے 150 لوگوں کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے۔ اسی دفعہ 8 کے خلاف یوروپین یونین اور حقوق انسانی کی تنظیمیں مسلسل آواز اٹھا رہی ہیں۔ حال ہی میں ایک ہزار سے زائد ممتاز ترک شہریوں نے اس دفعہ کے خلاف احتجاج کے طور پر تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ شائع کرکے حکومت کو اپنے خلاف مقدمہ چلانے کا چیلنج دیا ہے۔ ان شدید مخالفتوں سے گھبراکر تانزوسیلر نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دفعہ 8 کو انسداد دہشت گردی قانون سے خارج کردیں گی۔ لیکن وزیراعظم کے لئے یہ کام کرنا آسان نہ ہوگا کیونکہ خود بہت سے اراکین پارلیامنٹ اس دفعہ کے اخراج کے خلاف ہیں۔ ان میں خود وزیراعظم کی اپنی پارٹی کے بعض ممبران کے علاوہ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی اکثر جماعتوں کے اراکین بھی شامل ہیں۔

کرد پناہ گزیں خواتین امداد کے انتظار میں

وزیراعظم تانزوسیلر

> اب بھی تقریباً چار ہزار ترک فوج عراق میں کردوں کے خلاف کاروائی میں مصروف ہیں۔ اسے بنیاد بناکر یوروپی ممالک تانزوسیلر کو ہدف تنقید بنائے ہوئے ہیں تو دوسری طرف وزیراعظم کی اپنی پارٹی کے بعض ممبران اور بعض دوسری پارٹیاں انہیں ان قوانین کو نرم کرنے کی اجازت نہیں دے رہے ہیں جو دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔

اسلام پسندوں کی بڑھتی قوت کو روکنے کے لئے

نو آزاد مسلم ملک اریٹریا آمریت کی راہ پر

دو سال قبل آزاد ہونے والا اریٹریا ایک چھوٹا سا افریقی مسلم ملک ہے۔ اس نے ایتھوپیا سے ایک طویل جنگ کے بعد آزادی حاصل کی ہے۔ دراصل ایسا 1991ء میں ایتھوپیا میں کمیونسٹ حکومت کے زوال و انتشار کے بعد ہی ممکن ہوسکا۔ آزادی کی جنگ اریٹرین پیوپلز لبریشن فرنٹ کے زیر قیادت لڑی گئی تھی جو اب بدل کر پیوپلز فرنٹ فار ڈیموکریسی اینڈ جسٹس یعنی عوامی محاذ برائے انصاف و جمہوریت ہوگیا ہے اور ملک پر حکومت کر رہا ہے۔ ملک کا نیا دستور بنایا جارہا ہے مگر موجودہ حکمراں کھلے عام کہتے ہیں کہ ان پارٹیوں کو انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت نہ ہوگی جو مذہب یا نسل کی بنیاد پر قائم ہیں۔ یہ دراصل ان "بنیاد پرستوں" یعنی اسلام پسندوں کا راستہ روکنے کے لئے کیا جارہا ہے جو اپنی کم تعداد اور محدود اثر کے باوجود ملک کی واحد اپوزیشن پارٹی کا رول ادا کر رہے ہیں۔

اریٹریا میں صدارتی اور پارلیمانی انتخابات موجودہ حکمرانوں کے وعدے کے مطابق 1997ء میں ہوں گے جن میں ان کی کامیابی تقریباً یقینی ہے۔ آزادی کا نشہ ابھی اترا نہیں ہے۔ 1993ء میں آزادی کی تصدیق کے لئے کرائے گئے ایک ریفرنڈم میں 99.8 فیصد لوگوں نے موجودہ حکمرانوں کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ پوری امید ہے کہ یہ موڈ 1997ء کے پارلیمانی و صدارتی انتخابات تک قائم رہے گا اور موجودہ حکمراں اس کے بعد بھی حکومت کرتے رہیں گے۔

> ملک کا نیا دستور بنایا جارہا ہے مگر موجودہ حکمراں کھلے عام کہتے ہیں کہ ان پارٹیوں کو انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت نہ ہوگی جو مذہب یا نسل کی بنیاد پر قائم ہیں۔ یہ دراصل ان "بنیاد پرستوں" یعنی اسلام پسندوں کا راستہ روکنے کے لئے کیا جارہا ہے جو اپنی کم تعداد اور محدود اثر کے باوجود ملک کی واحد اپوزیشن پارٹی کا رول ادا کررہے ہیں۔

لیکن حکمراں عوامی محاذ برائے انصاف و جمہوریت کے سامنے ایک مسئلہ بھی ہے جو فوری توجہ کا طالب ہے۔ یعنی وہ سابق گوریلا جو ملک کی آزادی کی جنگ میں شریک تھے، انہیں کا مسئلہ۔ گذشتہ دو سالوں میں حکومت چالیس ہزار سے زائد ایسے گوریلا جنگجوؤں کو غیر مسلح کرچکی ہے۔ بعض معذور سابق مجاہدین آزادی حال ہی میں اپنے نظرانداز کئے جانے کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے تھے اور ٹریفک جام کردیا تھا۔ انہیں منتشر کرنے کے لئے پولیس نے گولی چلادی تھی جس سے چھ افراد ہلاک ہوگئے تھے۔

گوریلا جنگجوؤں کے ساتھ حکومت کا مسئلہ آزادی کے وقت ہی سے چلا آرہا ہے۔ اس وقت حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ یہ گوریلا مجاہدین مزید دو سال تک بغیر تنخواہ کے کام کرتے رہیں گے۔ مگر اس کے خلاف بہتوں نے احتجاج کیا تو تقریباً 100 کا کورٹ مارشل کردیا گیا اور بعضوں کو چار سال تک کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ ان میں سے بہت سے گوریلا فوج میں ہیں جن کی تعداد پچپن ہزار ہے۔ انہیں 25 ڈالر کی معمولی ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ تقریباً 9 ہزار ایسے ہیں جو بغیر تنخواہ کے دوسری سرکاری نوکریاں کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ آزادی حاصل ہونے سے ان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ وہ اب بھی ویسی ہی سختی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، جیسی کہ وہ محاذ پر بسر کرتے تھے۔ ہاں فرق یہ ہے کہ ان کے اہل خاندان اب پہلے کی بہ نسبت ان سے کچھ توقع کرتے ہیں جو بغیر تنخواہ کام کرنے کی وجہ سے وہ پورا نہیں کرسکتے۔

برطانوی اور ایرانی افسران کے درمیان خفیہ مذاکرات

ایران رشدی کے قتل کے فتوے سے پیچھے ہٹ رہا ہے

گذشتہ دنوں اپنے دورہ ہند کے دوران ایک پریس کانفرنس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ایرانی صدر ہاشمی رفسنجانی نے کہا تھا کہ ایران نے نہ تو پہلے کبھی سلمان رشدی کے قتل کے لئے کوئی "موت کا دستہ" بھیجا تھا اور نہ آئندہ ایسا کوئی دستہ بھیجنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جہاں تک رشدی کے خلاف امام خمینی کے فتوے کا سوال ہے تو دینیاتی بنیادوں پر اسے ایران ختم نہیں کرسکتا۔ اب تقریبا یہی بات ایک ایرانی افسر نے لندن میں دوہرائی ہے۔ یوروپی ممالک اور بعض وہ افراد جو رشدی کی حمایت میں ایک تحریک چلارہے ہیں، ایرانی رویے میں اس تبدیلی سے خوش ہوئے ہیں۔ فرانسس ڈی سوزا، جو انسانی حقوق کی ایک تنظیم آرٹیکل 19 کی سربراہ ہیں، نے اس ایرانی تبدیلی کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ یہ ان کے مطالبے کو پورا نہیں کرتا مگر ایرانی پالیسی میں یہ تھوڑی سی تبدیلی بھی بہت کچھ ہے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ ایران نے ماضی میں رشدی کے قتل کے لئے "موت کے دستے" روانہ کئے تھے۔ لیکن اگر اب تہران کی پالیسی یہ ہے کہ وہ ایسے دستے رشدی کے قتل کے لئے بھیجنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کے خلاف سیاسی و معاشی اقدامات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

کہا جارہا ہے کہ یہ ایرانی اعلان دراصل برطانیہ اور ایرانی افسران کے درمیان خفیہ مذاکرات کا نتیجہ ہے۔ ایک ایرانی افسر جس کا نام خفیہ رکھا جارہا ہے، نے صدر رفسنجانی کی ایماء پر برطانیہ اور دوسرے یوروپی ممالک کے ذمہ داروں سے گفتگو کرکے ان پر یہ واضح کیا کہ مذہبی و سیاسی اسباب کی وجہ سے امام خمینی کے فتوے کو واپس تو نہیں لیا جاسکتا لیکن اب ایرانی حکومت اس پر عمل نہ کرنے کا یقین دلاسکتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اسپین وغیرہ جو رشدی کی حمایت میں ایران کے خلاف تحریک میں پیش پیش رہے ہیں، ایران کی نئی پالیسی سے مطمئن ہیں اور تہران سے از سر نو تعلقات قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ان خفیہ مذاکرات کے دوران اس ایک ملین ڈالر انعام کی بات بھی زیر بحث آئی جو ایک ایرانی تنظیم نے رشدی کا سر قلم کرنے والے کے لئے متعین کی ہے۔ یوروپی ممالک کا کہنا ہے کہ یہ نیم سرکاری تنظیم ہے لیکن ایران نے اس سے انکار کرتے ہوئے اس تنظیم اور اس کے اعلان کردہ انعام سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے۔ یوروپی ممالک بظاہر اس ایرانی تشریح سے بھی مطمئن نظر آتے ہیں۔

ایران جن معاشی مسائل سے دوچار ہے اور امریکہ واسرائیل اس کے لئے جس طرح مزید مسائل پیدا کرنے کے درپے ہیں، خاص طور سے نیوکلیر ری ایکٹر کے مسئلے کو لے کر اس کی روشنی میں یوروپی ممالک سے تعاون بڑھانے کی ایرانی کوشش قابل فہم ہے۔ ظاہر ہے اس تعاون کے لئے انہیں رشدی کے خلاف اپنی سخت پالیسی کی قربانی دینی پڑی ہے جو اب ایران نے بخوشی ادا بھی کردی ہے۔

امریکہ و اسرائیل کی زبردست مخالفت کے پیش نظر ایران نے اپنی پہلے والی زیادہ سخت پالیسی میں حال ہی میں نرمی پیدا کی ہے۔ ظاہر ہے ایران کے اندر شدت پسندوں کا ایک طبقہ اس نرمی کے خلاف ہے لیکن اب شاید وہ بھی یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ ایران کے معاشی مسائل کے حل کے لئے انہیں اپنی شدت پسندانہ پالیسی میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی و لندن میں اعلان شدہ نرم ایرانی پالیسی کے بعد ان عناصر کی طرف سے نہ تو ایران میں اور نہ ہی ایران کے باہر کوئی سخت ردعمل دیکھنے کو ملا ہے۔ ایران جن معاشی مسائل سے دوچار ہے اور امریکہ واسرائیل اس کے لئے جس طرح مزید مسائل پیدا کرنے کے درپے ہیں، خاص طور سے نیوکلیر ری ایکٹر کے مسئلے کو لے کر اس کی روشنی میں یوروپی ممالک سے تعاون بڑھانے کی ایرانی کوشش قابل فہم ہے۔ ظاہر ہے اس تعاون کے لئے انہیں رشدی کے خلاف اپنی سخت پالیسی کی قربانی دینی پڑی ہے جو اب ایران نے بخوشی ادا بھی کردی ہے۔

امریکہ کے برعکس یوروپی ممالک ایران سے تعلقات قائم رکھنے کے خواہش مند ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جنگ خلیج کے بعد سعودی عرب اور کویت کی تیل کی دولت کا بڑا حصہ امریکہ کے پاس جارہا ہے۔ عراق پر تیل برآمد کرنے کی پابندی ہے۔ اس طرح ایران خلیج میں تیسرا بڑا ملک ہے جو بڑے پیمانے پر تیل پیدا کرتا ہے۔ تیل کی اس بڑی تجارت سے خصوصا امریکہ کے یک طرفہ اور کسی حد تک احمقانہ، ایران مخالف اقدام کے بعد یوروپی ممالک فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ امریکہ اس یوروپی پالیسی کے خلاف ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے یہ حامی ممالک اسی کی طرح ایران کے خلاف مکمل معاشی پابندی عائد کردیں۔ مگر یوروپی ممالک کا کہنا ہے کہ ایران کو الگ تھلگ کرنے کی پالیسی غلط ہے۔ یوروپ کی اس پالیسی سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لئے ہی ایران نے بڑی ہوشیاری سے رشدی کے قتل کے لئے "موت کا دستہ" نہ بھیجنے کا اعلان کیا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس اعلان سے رشدی کے خلاف فتوی کی ایرانی پالیسی جوں کی توں باقی رہتی ہے مگر چونکہ یہ ایران و یوروپ دونوں کے مفاد میں ہے اس لئے دونوں ہی اسے بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں۔

لندن یونیورسٹی میں شاہ فہد چیئر برائے دراسیات اسلامیہ کا قیام

یوروپ کو اسلام سے روشناس کرانے کی ایک قابل قدر کوشش

پچھلے دنوں لندن یونیورسٹی کے مشرقی و افریقی مطالعات کے کالج میں شاہ فہد چیئر برائے دراسیات اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس موقع پر سعودی سفیر ڈاکٹر غازی القصیبی نے کالج کے ڈائرکٹر پروفیسر مائیکل ماکولیم کی خدمت میں ایک ملین پاؤنڈ اسٹرلنگ کا چیک پیش کیا۔

اس کالج کے قیام کا خیال رے کمیٹی کو 1908ء میں مشرقی اور افریقی علوم کے مطالعے کے ضمن میں آیا تھا اور 1917ء میں یہاں طلباء آنے شروع ہوئے۔ اس سے اب تک معروف علمی شخصیتیں وابستہ رہ چکی ہیں۔

یہ مالی تعاون خدمت اسلام کے میدان میں سعودی عرب کی مساعدت و تعاون کی ایک کڑی ہے۔ ڈاکٹر قصیبی نے دراسیات اسلامیہ کے لئے اس چیئر کے قیام کے سلسلے میں لندن یونیورسٹی کے اقوام کے حوالے سے کہا کہ اس سے عرب اور اسلامی دنیا میں عربی اور اسلامی مطالعات کو وسعت و ترقی ملے گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ علم کے فروغ کے لئے سعودی حکومت کی یہ مالی اعانت غیر ممالک میں اسلام اور اسلامی ثقافت کی ترقی و اشاعت میں اس کی دلچسپی کی بھی آئینہ دار ہے۔ موصوف نے یہ بھی کہا کہ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ مملکت سعودی عرب نزول قرآن کی سرزمین کی حیثیت سے خادم حرمین شریفین کی سرپرستی میں اسلام کا صحیح رخ پیش کرنے میں قائدانہ کردار ادا کر رہی ہے۔

> **پروفیسر ماکولیم نے اس جانب اشارہ کیا کہ دراسیات اسلامی کے ایسے خصوصی مراکز یورپ میں نہیں پائے جاتے جو اسلام کی تصویر کو بہتر طور پر پیش کرنے اور قرآن وسنت پر سنجیدہ علمی تحقیق اور یورپ کی لائبریریوں میں جا بجا بکھرے ہوئے تراجم کے تنقیدی مطالعے کے میدان میں آگے آئیں۔**

شاہ فہد چیئر برائے دراسیات اسلامیہ کے قیام کے مقاصد مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) قرآنی علوم اور حدیث نبوی کے مطالعے کے عربی ماخذ و مصادر کے مطالعہ و تحقیق کی حوصلہ افزائی۔

(2) علوم قرآن وحدیث میں ایم۔ اے کی سطح پر اعلی تعلیم کے پروگرام کی تیاری۔

(3) دراسیات اسلامیہ کے لئے یونیورسٹی میں خصوصی مطالعہ کے مرکز کی سرپرستی۔

کالج برائے مشرقی و افریقی مطالعات کے ڈائرکٹر پروفیسر مائیکل ماکولیم نے شرق اوسط کو دیے گئے ایک انٹرویو میں بتایا کہ مذکورہ کالج کو برطانیہ میں ایک اہم علمی ادارے کی حیثیت حاصل ہے کیونکہ مغربی یورپ میں عربی و اسلامی مطالعات کا اہتمام نہیں تھا۔ پروفیسر ماکولیم نے اس جانب اشارہ کیا کہ دراسیات اسلامی کے ایسے خصوصی مراکز یورپ میں نہیں پائے جاتے جو اسلام کی تصویر کو بہتر طور پر پیش کرنے اور قرآن و سنت پر سنجیدہ علمی تحقیق اور یورپ کی لائبریریوں میں جا بجا بکھرے ہوئے تراجم کے تنقیدی مطالعے کے میدان میں آگے آئیں۔
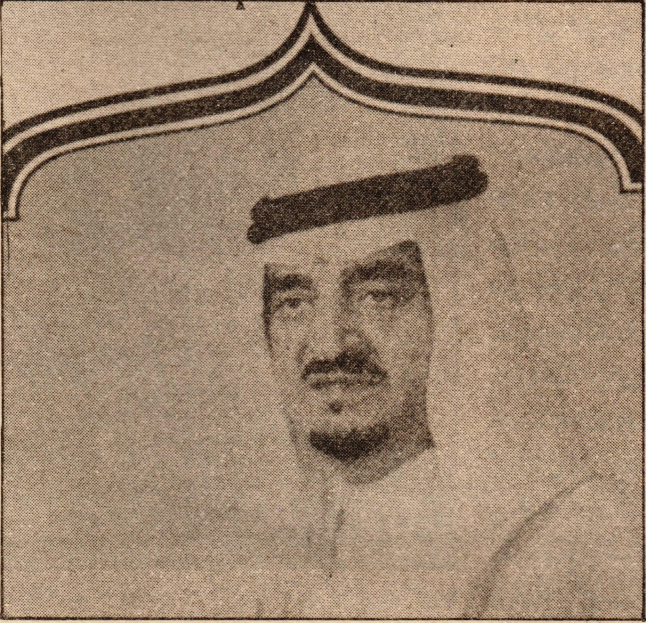
شاہ فہد کی طرف سے یہ پیش کش ایسے موزوں وقت پر ہوئی ہے جب اسلام اور مغرب کے درمیان تفاہم و تقارب اور اسلام کو درست اور معتبر تراجم کے ذریعے پیش کرنے میں دنیا کے ہر کونے سے دلچسپی کا اظہار ہورہا ہے۔ پروفیسر موصوف نے یہ بھی کہا کہ اسی ماہ ستمبر سے اسلامی دنیا اور مغرب کے درمیان طلباء کا تبادلہ عملاً ممکن ہوسکے گا۔ نیز یہ کہ وہ اپنے بعض رفقاء کار کے ہمراہ دنیا کے دراسیات اسلامی کے مختلف مراکز اور یونیورسٹیوں کا دورہ کرکے علوم قرآنی و حدیث اور ترجمے کے میدان میں اور اسلام کو متعارف کرانے میں لندن یونیورسٹی میں قائم اس چیئر کی متوقع خدمات سے طلباء اور محققین کو آگاہ کریں گے۔ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یونیورسٹی میں شاہ فہد چیئر کے اضافے سے جن باصلاحیت ذہنوں کو استفادہ کا موقع اسے ملے گا یقینا اسلام کی خدمت میں نمایاں اور پر اثر کردار ادا کرے گا۔

کالج برائے مشرقی و افریقی مطالعات کے ذرائع کے مطابق اس موقر منصب کے لئے موزوں ترین امیدوار ڈاکٹر محمد عبدالحلیم ہوسکتے ہیں جنہوں نے اشرق الاوسط کے نامہ نگار سے گفتگو کے دوران کہا کہ اس چیئر کا قیام ایسے وقت میں عمل میں آیا ہے جب پوسٹ گریجویٹ سطح پر تعلیمی پروگراموں کی جدید کاری ہورہی ہے اور جس میں قرآن کریم اور حدیث اور انگریزی زبان میں اس کے ترجمے کو اولین اہمیت دی جارہی ہے۔

ڈاکٹر عبدالحلیم نے شاہ فہد کے اس فیصلے کو اسلام اور دیگر معاشروں کے درمیان تہذیبی تقابل اور اسلام کے روشن پہلو کی وضاحت اور اسلام کی دینی و فکری عظمت کی دلالت کی سمت میں ایک اہم قدم سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ یہ قدم اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ یہ اس یوروپ کو اسلام سے روشناس کرائے گا جو ابھی تک اسلام کو دہشت گردی اور تشدد کا مذہب سمجھتا رہا ہے۔

کیا بے نظیر حکومت اہانت رسول کے قانون کو نرم کرنا چاہتی ہے؟

وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر کے بیان پر پاکستان میں زوردار ھنگامہ

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت پاکستان نے قانون اہانت رسول میں تبدیلی کے فیصلے کو سردست بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اس بات کا اشارہ وزیر داخلہ نصیر اللہ بابر نے اپوزیشن اور مذہبی پارٹیوں کی کامیاب ملک گیر ہڑتال کے بعد دیا ہے۔ یہ ہڑتال سنیچر کو مولانا شاہ احمد نورانی کی زیر قیادت ملی یکجہتی کونسل کی اپیل پر کی گئی تھی اور جناب نواز شریف کی اپوزیشن پارٹی نے اس کی حمایت کی تھی۔ ہڑتال انتہائی کامیاب رہی۔

نصیر اللہ بابر نے یہ انکشاف کرکے کہ ان کی حکومت قانون اہانت رسول میں بعض تبدیلیاں کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، انتخابی طور سے کمزور مگر مذہبی طور پر طاقتور جماعتوں کو سرگرم کردیا۔ مجوزہ تبدیلیوں میں سے ایک یہ ہے کہ ان افراد کو دس سال جیل کی سزا ہوسکتی ہے جو کسی پر توہین رسالت کا جھوٹا الزام لگاتے ہیں۔ دوسری مجوزہ تبدیلی یہ تھی کہ کسی بھی شخص کو، جس پر توہین رسالت کا الزام ہے، جیل اسی وقت بھیجا جاسکتا ہے جب مجسٹریٹ یہ کہہ دے کہ ملزم کے خلاف مقدمہ چلانے کے لئے کافی شہادتیں موجود ہیں۔

غیر تبدیل شدہ قانون کے مطابق توہین رسالت کے ملزم کو اس وقت جیل بھیج دیا جاتا ہے جب اس کے خلاف کوئی شکایت درج کی جاتی ہے۔

قانون کی اس شق کا پاکستان میں بعض لوگوں نے بڑا غلط استعمال کیا ہے۔ ملک کے اندر اور خاص طور سے بیرون ملک بہت سی تنظیمیں اس قانون کو لے کر پاکستان کے خلاف ایک مہم چلائے ہوئے ہیں۔ ان کا مطالبہ ہے کہ اس قانون کو فورا تبدیل کردیا جائے۔ مغرب کی حکومتوں اور حقوق انسانی کی تنظیموں نے بھی اسے آڑ بنا کر حسب عادت پاکستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت شروع کردی ہے۔ اور یہ بیرونی دباؤ ہی کا نتیجہ تھا کہ نصیر اللہ بابر نے قانون اہانت رسول میں بعض تبدیلیاں کرنے کا اشارہ دیا تھا۔

حکومت پاکستان کو اندازہ تھا کہ اس قانون میں کوئی تبدیلی کرنا آسان نہ ہوگا، چنانچہ نصیر اللہ بابر نے پہلے ہی ان تمام مذہبی جماعتوں سے بات کرلی تھی جن کی نمائندگی پارلیامنٹ میں ہے اور ان کے بقول ان ساری جماعتوں نے مجوزہ تبدیلیوں کی یہ کہہ کر حمایت کی تھی کہ اس قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے یہ ضروری ہیں۔ مگر شاہ احمد نورانی، جو بریلوی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، اور جنہوں نے جنگ خلیج کے دوران زبردست امریکہ مخالف مہم چلائی تھی، اس مجوزہ تبدیلی کے خلاف سرگرم ہوگئے۔ انہوں نے کہا کہ بحیثیت مسلمان یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ توہین رسالت کے مجرم کو پھانسی کی سزا دیں، انہوں نے ان ممبران پارلیامنٹ کو بھی تشدد کی دھمکی دی جو مجوزہ تبدیلی کی حمایت کی جرات کریں گے۔ مزید برآں انہوں نے نصیر اللہ بابر پر الزام لگایا کہ وہ اسلام کے خلاف مغرب و امریکہ کی سازش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کررہے ہیں۔

سنیچر کی کامیاب ہڑتال کے بعد حکومت پاکستان گھبرا سی گئی ہے۔ چنانچہ نصیر اللہ بابر نے فوراً ہی مذہبی جماعتوں کو یہ یقین دلایا کہ ان کا ارادہ توہین رسالت کے مجرم کی سزا میں تخفیف کرنا نہیں تھا بلکہ ان لوگوں کے خلاف کارروائی کے لئے قانون میں گنجائش پیدا کرنا تھا جو اس قانون کا سہارا لے کر اپنے ذاتی دشمنوں کے خلاف انتقامی اقدامات کرتے ہیں، انہوں نے کہا کہ اہانت رسول کے مجرم کو پھانسی کی سزا برقرار رہے گی۔ لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ علماء اور مذہبی جماعتوں سے اس قانون کو مزید بہتر بنانے کے لئے گفتگو کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

مبصرین کا خیال ہے کہ بے نظیر حکومت سردست اس قانون میں اب کوئی تبدیلی کرنے کا خیال بھی نہیں کرے گی۔ ہاں البتہ یہ ممکن ہے کہ مذہبی جماعتوں اور علماء سے مزید بات چیت جاری رہے۔ اگر ایسی گفتگوئیں کامیاب ہوتی ہیں تو ممکن ہے کہ مستقبل میں کوئی ایسی صورت نکل آئے جس سے قانون اہانت رسول کے غلط استعمال کو روکا جاسکے۔ مگر اس سلسلے میں حکومت کے سامنے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اسے پہلے عوام اور علماء دونوں کو یہ یقین دلانا ہوگا کہ اس کا یہ اقدام امریکہ کے اشارے پر نہیں ہے۔ بے نظیر حکومت پر حال ہی میں امریکہ نوازی کا الزام شدت سے لگایا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی حکومت کے برعکس وہاں کے عوام میں امریکہ کے خلاف وسیع پیمانے پر شدید جذبات پائے جاتے ہیں۔

> **مجوزہ تبدیلیوں میں سے ایک یہ ہے کہ ان افراد کو دس سال جیل کی سزا ہوسکتی ہے جو کسی پر توہین رسالت کا جھوٹا الزام لگاتے ہیں۔ دوسری مجوزہ تبدیلی یہ تھی کہ کسی بھی شخص کو، جس پر توہین رسالت کا الزام ہے، جیل اسی وقت بھیجا جاسکتا ہے جب مجسٹریٹ یہ کہہ دے کہ ملزم کے خلاف مقدمہ چلانے کے لئے کافی شہادتیں موجود ہیں۔**

یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کے مسئلے پر

مرکز کی نامرد حکومت سے کوئی توقع نہیں

ملک کے عام مسائل خصوصاً مسلم معاملات پر ہندو احیاء پسندوں کے نظریات و خیالات یکسر مختلف اور مسلم دشمن ہوتے ہیں۔ اس وقت اخبارات میں دو معاملات چھائے ہوئے ہیں۔ ایک یکساں سول کوڈ اور دوسرا چرار شریف کی بربادی۔ آر ایس ایس کا ترجمان "پانچ جنیہ" ان معاملات پر خوب زہر افشانی کر رہا ہے ان مسائل پر ہندو احیاء پسندوں کے نظریات و خیالات کیا ہیں؟ قارئین کو ان سے واقف کرانے کے لئے ہم پانچ جنیہ کے 21 مئی کے شمارے میں شائع ارون شوری کی ایک تحریر اور پانچ جنیہ کا اداریہ پیش کر رہے ہیں۔

دس مئی کو سپریم کورٹ نے جو فیصلہ دیا اس سے ہماری اصلیت اجاگر ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ تصور کیجئے ہماری حالت یہ ہو گئی ہے کہ سپریم کورٹ کو کہنا پڑا کہ پینتالیس سال ہو گئے دستور کے آرٹیکل 44 کو نافذ تو کیجئے اور اس سمت میں ایک قدم تو آگے بڑھائیے۔ سپریم کورٹ کو یہ بات کہنی پڑی اور وہ بھی منت و سماجت کے انداز میں تو یہ بڑی شرمناک بات ہے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ سپریم کورٹ کے ان الفاظ پر حیرت زدہ کیوں ہیں۔

سوشلزم کے دور میں دستور کے رہنما اصولوں کی بہت تشہیر کی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ رہنما اصول بنیادی حقوق سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں (دستور کا آرٹیکل 44 رہنما اصولوں کے زمرے میں آتا ہے) سوشلزم کا اصل ایشو یہی تھا۔ لیکن سچائی کیا ہے۔ یکساں سول کوڈ کا معاملہ رہنما اصولوں میں ہی شمار ہوتا ہے اور اسی طرح گئو کشی پر پابندی کی بات بھی انہی اصولوں کے تحت آتی ہے۔ لیکن یکساں

لیکن ہندوستان کی حکومت خود بہت کمزور ہے۔ ایسے فیصلوں پر اگر کوئی کاروائی نہیں ہوتی تو اس کے پیچھے بھی وہی اسباب ہیں جن سے بنگلہ دیشی دراندازوں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہوئی، جن اسباب سے، جموں کے پناہ گزینوں کے سلسلے میں ہم کچھ نہیں کرتے، جن اسباب سے حضرت بل میں ہم بریانی پہنچاتے رہتے ہیں اور چرار شریف میں ہم دہشت گردوں کو فرار ہونے کا راستہ دیتے ہیں۔

سول کوڈ کے نفاذ کے لئے حکومت نے کچھ بھی نہیں کیا باوجود اس کے کہ گذشتہ دس سالوں میں تین چار بار سپریم کورٹ حکومت کو اس طرف توجہ دلا چکی ہے مختلف ہائی کورٹوں کی طرف سے پہلے ہی اس موضوع کو اٹھایا جا چکا ہے۔ راقم السطور نے بھی اپنی کتاب "اے سیکولر ایجنڈا" میں تفصیل سے اس بارے میں لکھا ہے۔

مذکورہ کتاب میں کیرالا ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کا بیان ہے۔ میری سونیز ذکریا بنام حکومت ہند (1990) کے اس مقدمے میں عدالت نے لاء کمیشن کی سفارشوں اور ملک کی دیگر عدالتوں کے فیصلوں کے حوالے سے طلاق سے متعلق قانون میں ترمیم کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ عدالت نے اس بات پر اظہار افسوس بھی کیا ہے کہ ملک کی مختلف عدالتوں کی طرف سے بارہا کہے جانے کے باوجود اس سمت میں کوئی پیش قدمی نہیں ہوئی۔

اس فیصلے کے ذریعے عدالت نے حکومت کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ چھ ماہ کے اندر لاء کمیشن کی سفارشات کے مطابق اس قانون کو موجودہ حالات میں نافذ کرے۔ عدالت کی طرف سے اس ہدایت کو
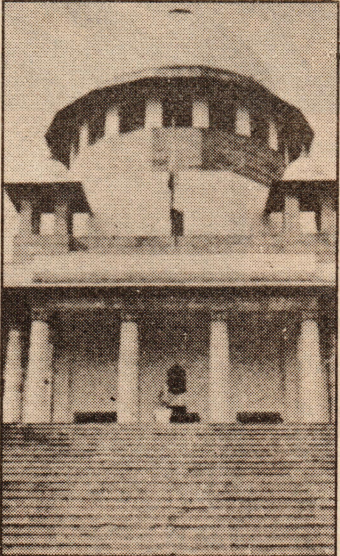
جاری ہوئے پانچ سال گزر چکے ہیں لیکن آج تک کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔

اب شاہ بانو کیس کو دیکھئے۔ 1985ء میں اس معاملے میں سپریم کورٹ نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ آرٹیکل 44 اب ایک مردہ لفظ بن چکا ہے۔ عدالت نے یہ بھی کہا کہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ حکومتی سطح پر ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی سمت میں کوئی کوشش

ارون شوری کی جھنجھلاہٹ

ہوئی ہو۔ عدالت عظمی نے یہ بھی تسلیم کیا کہ یکساں سول کوڈ کے نفاذ سے قومی اتحاد کا فروغ ہوگا۔ عدالت نے کہا کہ کوئی بھی دھرم یا مذہب خود کو حاصل مخصوص رعایتوں سے دست بردار ہو کر اس سمت میں کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ اس لئے خود حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ یکساں سول کوڈ نافذ کر کے اپنے فرض کو پورا کرے۔ اپنے اس فیصلے میں عدالت نے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی راہ میں آنے والی دشواریوں کا بھی ذکر کیا اور آگے چل کر یہ بھی کہا کہ اگر دستور کے کوئی معنی ہیں تو اس جانب پیش قدمی ہونی ہی چاہئے۔ اس فیصلے کو آج دس سال ہو چکے ہیں اور کس طرح اس فیصلے کو بعض سیکولر پارٹیوں نے اپنے ووٹ بینک کے لئے پلٹ دیا یہ کہانی سب کو بخوبی معلوم ہے۔

عدالت کی ہدایت

شاہ بانو کیس کے کچھ ہی دن بعد اسی سال مسٹر جوڈین ڈینڈیک بنام ایس ایچ چوپڑہ کے مقدمے میں بھی سپریم کورٹ نے یکساں سول کوڈ کی ضرورت کی واضح الفاظ میں حمایت کی۔ اس مقدمے کا ذکر کرتے

بقیہ صفحہ ۱۲ پر

"غداروں کو پناہ دینے والی عبادت گاہوں کو اڑا دینا کارِ ثواب ہے"

چرار شریف کے مسئلے پر آر ایس ایس کے ترجمان پانچ جنیہ کا زہریلا اداریہ اور اسکا جواب

بولو اس ملک کے بخاریو اور شہاب الدینو۔ اب چرار شریف مسجد ایکشن کمیٹی کب بنا رہے۔ ایک مسجد جلی ہے اور مسلمانوں نے ہی جلائی ہے۔ اس میں بیٹھ کر ہر طرح کے گھناؤنے کام بھی کئے ہیں۔ کیا یہ بابری مسجد کی طرح ایک بار پھر مسلم ممالک سے چندہ بٹورنے کا سنہرا موقع نہیں۔ مانا کہ یہ مسلمان لیڈر نہیں تسلیم کریں گے کہ ایک مسجد میں بیٹھ کر مادر وطن کے خلاف بغاوت کرنے والوں سے مسجد ناپاک ہوئی ہے نہ ہی وہ یہ کہیں گے کہ پاکستان کی شہ پر دہشت گردی پھیلانے والے

ارے اس ملک کے نمک پر زندہ غیر وطن پرست شدت پسندو! اگر یہ ملک اپنے حملہ آوروں کی بربریت کی نشانی والے ڈھانچوں کو مسمار کرتا ہے تو تمہارے دلوں میں محمد بن قاسم کے دل میں جلی "دوزخ کی آگ" کیوں جلنے لگتی ہے۔

مسلمان سخت سزا کے مستحق ہیں۔ لیکن جو مسلمان پاکستانی روپیوں کے عوض ایک مشہور اور قدیم مسجد جلا دیتے ہیں ان کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔

چونکہ مسجد جلانے والے مسلمان تھے، پاکستان کی شہ پر کام کر رہے تھے صرف اس لئے مسجد جلنے کا دکھ دب گیا، ڈھک گیا۔ اس کا رخ بدلنے کی کوشش ہونے لگی۔ یعنی ان مسلم لیڈروں کو مسجد، درگاہ، قرآن، شریعت ان معاملات سے دراصل اسی وقت تک لگاؤ ہے جب تک ان کا استعمال ہندو سماج کے خلاف جہاد کے جذبات بھڑکانے میں کیا جا سکے۔ جس لمحے ایسا محسوس ہو کہ مسجد کو نذر آتش کرنے یا قرآن کی توہین کا استعمال ہندوؤں کے خلاف نہیں کیا جا سکتا، یہ دروازے بند کر کے چپ بیٹھ جاتے ہیں یا ایسے بیان دیتے ہیں جن کا کوئی مفہوم ہی نہ نکلے۔

سیدھی سی بات ہے کہ ان مسلمان لیڈروں کا ان کے پاکستان آقاؤں اور ان کے جنتا دل کمیونسٹ و مارکسٹ اور کانگریس پارٹی جیسے حامی اور دیگر نقلی سیکولر جماعتوں کی اصل دشمنی ہندتو سے ہے اور ہندتو پر حملہ کرنے کے لئے وہ ہر موقع کو استعمال کرنا چاہتے ہیں چاہے اس کے لئے انہیں ملک دشمن افراد کی ہی طرفداری کیوں نہ کرنی پڑے۔ وہ کشمیری دہشت گردوں کے انسانی حقوق کے مسئلے پر چلاتے رہتے ہیں اور چرار شریف کے واقعے پر بالٹیاں بھر بھر کر آنسو بہا رہے ہیں لیکن جھوٹے ردعمل میں سری نگر میں حفاظت سے عاری اکیلے کھڑے مندروں کی آتش زدگی پر کوئی نہیں بولا۔ کیوں کہ جس طرح بمبئی کے بم حادثے میں ہلاک ہونے والے بے قصور ہندو محض مسلم ردعمل کا شکار تھے جو دبی زبان میں آج بھی فطری اقدام کہا جاتا ہے اسی طرح چرار شریف چاہے کوئی بھی جلائے اس کے ردعمل میں مندر جلے تو کوئی بات نہیں۔

اس واقعے سے پھر یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ زیادہ اہمیت کس کی ہے بھارت ماتا کے مندر یا کسی بھی مذہب، فرقے یا عقیدے کی عبادت گاہ کی۔ نرسمہاراؤ سبق سیکھیں اور ایسی سخت پالیسی بنائیں کہ ملک کے غداروں کو جس کسی کی بھی عبادت گاہ میں پناہ ملے ہندوستان بچانے کے لئے اس تمام ڈھانچے کو اڑا دینا کار خیر سمجھا جائے۔

پاکستان میں بھٹو کے مزار کے لئے مسجد توڑی جائے تو کوئی بات نہیں۔ سعودی عرب میں امریکی فوجیوں کی چھاؤنی کے لئے مسجدیں توڑی جائیں تو کوئی بات نہیں۔ ارے اس ملک کے نمک پر زندہ غیر وطن پرست شدت پسندو اگر یہ ملک اپنے حملہ آوروں کی بربریت کی نشانی والے ڈھانچوں کو مسمار کرتا ہے تو تمہارے دلوں میں محمد بن قاسم کے دل میں جلی "دوزخ کی آگ" کیوں جلنے لگتی ہے۔ اس کے ردعمل کی سنگینی کا احساس ہے تمہیں ہندوستان اکیسویں صدی میں کمزور ہاتھوں اور بے

جان دل سے نہیں داخل ہو رہا ہے، اتنا یاد رکھنا۔ بہت خوب! شاباش! اسی طرح دل کی بات اگلتے رہا کرو تو مزے سے کما کھاؤ گے۔ اس دیانتدارانہ

باقی صفحہ ۱۲ پر

”آج یورپ اسلام کے مدمقابل نہیں بلکہ یورپ میں ا

یورپ میں اسلامی انقلاب کے آ

لندن کے ایسٹ اینڈ علاقے میں فورنیر اسٹریٹ اور برک لین کے کونے پر ایک چھوٹا سا چرچ ہے جسے 1743ء میں قائم کیا گیا تھا۔ کبھی یہ عمارت یہودی عبادت گاہ بھی رہ چکی ہے۔ مگر مقامی مسلمانوں نے اسے خرید کر اب ایک مسجد میں تبدیل کردیا ہے۔ چرچ کی اس انداز سے مسجد میں تبدیلی آج یورپ میں عام بات ہے۔ اسی مسجد کی سامنے کی دیوار پر ایک پوسٹر ہے جس میں قیام خلافت کے لئے جدوجہد کی اپیل کی گئی ہے۔

کچھ ایسا ہی منظر یورپ کے ہر بڑے شہر میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ پیرس کے ایک علاقے میں ایک بڑے WareHouse کو خرید کر مسجد میں تبدیل کردیا گیا ہے جہاں ہزاروں مسلمان نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ ہر جمعہ کو اسی سالہ امام مسجد نمازیوں کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ مستقبل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے جو اس سے وابستہ ہوگا مستقبل بھی اسی کا ہوگا۔

مگر یہ وہ پیغام نہیں ہے جس کی یورپ نے کبھی سننے کی تمنا کی ہو 1250 سال قبل اسپین کے راستے سے ایک مختصر اسلامی فوج نے فرانس کی سرحد پر چڑھائی کی تھی جسے فرانسیسی کمانڈر چارلس مارٹیل نے پسپا کردیا تھا۔ یوروپی تاریخ نویسوں کے بقول مارٹیل نے ایک طرح سے فاتح مسلم فوج کو مغربی یوروپ کو فتح کرنے سے روک دیا تھا۔ اس وقت سے بیسویں صدی کے آغاز تک مغربی یورپ میں مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔

لیکن بیسویں صدی، خصوصاً اس کی دوسری دہائی سے یوروپ کا نقشہ بدل چکا ہے اور اس کے ہر بڑے شہر میں آج مسلمان بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ آبادی کے ایک فرانسیسی ماہر کے بقول "یوروپ اسلام کا نیا محاذ بنتا جارہا ہے"۔

آج یوروپی اندازوں کے مطابق مغربی یوروپ میں مسلمانوں کی تعداد 8 ملین سے زائد ہے۔ مسلمان اسے دس ملین سے زیادہ بتاتے ہیں۔ دراصل یوروپی مردم شماری میں لوگوں کے مذہب کے بارے میں معلوم نہیں کیا جاتا چنانچہ وہ ہزاروں سفید و سیاہ فام باشندے جنہوں نے اسلام قبول کرلیا ہے وہ ان مسلمانوں کے ساتھ شمار نہیں کئے جاتے جو مسلم ملکوں یا برصغیر ہند و پاک سے آکر مغربی یوروپ میں آباد ہوئے ہیں۔ بہرحال مغربی یوروپ کے ہر ملک میں مسلمان قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ فرانس میں 22 لاکھ، جرمنی میں بھی 22 لاکھ اور برطانیہ میں 13 لاکھ سے زائد مسلمان آباد ہیں۔

سالہا سال سے ایک دوسرے کا پڑوسی ہونے کے باوجود مسلمانوں اور عیسائی آبادی کے تعلقات مثالی نہیں کہے جاسکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دوسرے کے قریب آنے کے باوجود مسائل میں اضافہ ہوا ہے نہ کہ کمی۔ یوروپ اسلام کو اب بھی زمانہ وسطی کی طرح جارح تصور کرتا ہے۔ خود یوروپ کی اپنی غلط پالیسیوں کی وجہ سے شمالی افریقہ اور مشرق وسطی میں ایک افراتفری کا عالم ہے جس کی وجہ سے وہاں مغرب کے خلاف جذبات بڑے شدید ہیں۔ اس صورت حال نے یوروپ کو مزید اسلام کے خلاف برگشتہ کردیا ہے۔ بوسنیا میں مسلمانوں کا قتل عام روکنے میں یوروپ کی ناکامی نے بھی مسلمانوں کو مغرب مخالف بنانے میں کافی بڑا رول ادا کیا ہے۔ مسلمانوں کو مغرب کی مخالفت اور مشرق وسطی و شمالی افریقہ میں اسلام کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ کر مغربی سیاستداں اور دانشور اسے ایک خطرہ کے طور پر پیش کررہے ہیں جس کی وجہ سے اور بھی عوامی سطح پر عیسائیوں اور مسلمانوں کے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی ہے۔ خاص طور سے دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے انتہاپسند عیسائی نوجوان، جن کی خاص پہچان ان کے منڈھے ہوئے سر ہوتے ہیں، مسلمانوں پر حملہ کرکے دہشت گردی پھیلانے میں مصروف ہیں۔ بعض مقامات پر مسلم نوجوانوں نے بھی ان کے خلاف کارروائی کی ہے جس سے حالات مزید خراب ہوئے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود یوروپ میں اسلام کا اثر روز بروز بڑھ رہا ہے اور یوروپی زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی موجودگی محسوس کی جارہی ہے۔ ایک فرانسیسی اسکالر کیپل نے اس صورت حال کو یوں بیان کیا ہے "آج یوروپ اسلام کے مدمقابل نہیں ہے بلکہ یوروپ اسلام میں ہے اور اسلام یوروپ میں ہے"۔ دراصل کئی ممالک مثلاً بلجیم، فرانس، اٹلی اور اسپین میں مسلمانوں کی تعداد یہودیوں اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں سے زیادہ ہوچکی ہے اور

کسی شہر میں داخل ہوتا ہے تو وہ ایک طرح
محسوس کرتا ہے کہ جیسے وہ ان چاہا مہمان ہو
صورت حال کے پیدا کرنے میں یوروپ کی

مسلسل بڑھ رہی ہے۔ فرانس کا کہنا ہے کہ آئندہ پندرہ سالوں میں مسلمانوں کی تعداد موجودہ 22 لاکھ سے بڑھ کر 60 یا 80 لاکھ ہوسکتی ہے۔ اگرچہ فرانس کی پالیسی یہ ہے کہ ان مسلمانوں کو مغربی کلچر میں رنگ دیا جائے مگر مسلمان اس کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ان کی بچیاں پابندی کے باوجود اسکارف باندھتی ہیں اور مسجدوں اور نمازیوں کی تعداد میں بھی روزافزوں اضافہ ہورہا ہے۔

معاشی طور پر یوروپی مسلمان شمالی افریقہ اور مشرق وسطی کے متعدد ممالک کی بہ نسبت زیادہ خوشحال ہیں اور آزادی کی فضا میں سانس بھی لے رہے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ انہیں اس نئی دنیا میں بہت سے مسائل کا بھی سامنا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ پڑوس میں رہنے والے یوروپی ان کے بارے میں بڑی غلط رائے رکھتے ہیں۔ فرانس میں ایک سروے کے دوران جب مسلمانوں سے چند الفاظ کی ایک فہرست میں سے ایسے تین الفاظ منتخب کرنے کو کہا گیا جو ان کے نزدیک اسلام کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں تو ایک بڑی اکثریت نے "جمہوریت" "انصاف" اور "آزادی" کے الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اسی فہرست میں سے غیر مسلموں نے اسلام کی تصویر کشی کے لئے "مذہبی جنونیت" اور "مغربی اقدار کی تردید" جیسے الفاظ کا انتخاب کیا۔ دراصل مدتوں سے ایک دوسرے کا پڑوسی ہونے کے باوجود دونوں قوموں کے درمیان غلط فہمی کی خلیج بہت وسیع ہے۔

چنانچہ آج جیسے ہی کوئی مسلمان یوروپ کے

معاشی حالت کا بھی بڑا رول ہے۔ آج مس
نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد بے روزگار ہے اور غ
یا صحیح طور پر محسوس کرتی ہے کہ یوروپی حکومت
ان کے لئے کچھ نہیں کررہی ہیں۔ چنانچہ فرانس ا
بلجیم میں تو باقاعدہ حکومت کے اس امتیازی سلوک
کے خلاف پرتشدد مظاہرے بھی ہوچکے ہیں
مسلمانوں کو یہ بھی شکایت ہے کہ چند نوجوانوں کی
جذباتیت کو بہانہ بناکر یوروپی پولیس پوری کمیونٹی
عرصہ دراز تک تنگ کرتی رہتی ہے۔

انقلابی اسلام اور مغرب کے درمیان حال
کشمکش کا بھی یوروپ میں مسلمانوں اور عیسائیو

مغر
سرگ

فرانس
2.2 ملین
چونکہ شمالی افریقہ فرانس کی کالونی رہا ہے اس لئے مراکش اور الجزائر کے مسلمان یہاں زیادہ آباد ہیں

کے تعلقات پر اثر پڑا ہے۔ تناؤ کی حالت میں لوگ
ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبات کی
پرورش کرنے لگتے ہیں۔ پھر اسلام اور مسلمانوں کی
تاریخ تو آغاز اسلام ہی سے کشمکش سے عبارت ہے
۔ صلیبی جنگ، جہاد، استعمار اور استعمار مخالف قومی
انقلابات، دہشت گردی اور جوابی دہشت گردی
اور کیا کچھ نہیں ہے تاریخ میں جو عیسائیوں اور

بقیہ: کشمیر میں لرزہ خیز مظالم کا لامتناہی سلسلہ

آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ اس نے کہا "اگر ان افسران کو میرے گھر آنے سے نہ روکا گیا تو میں اپنی جان دے دوں گی"۔

سیکورٹی فورسز کے خلاف محاصرے اور تلاشی کے دوران دست درازی کرنے کے الزامات بڑے پیمانے پر عائد کئے جاتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ 1990ء سے چلا آرہا ہے۔ خواتین کی آبروریزی کے واقعات کی اتنی زیادہ شکایات ہیں کہ انسانی حقوق کی تنظیموں سے وابستہ بیشتر افراد کا یہ قوی احساس ہے کہ وادی کے عوام کو مسلح جدوجہد کی حمایت کرنے سے باز رکھنے کے لئے اس "جرم" کو بطور ہتھیار استعمال کیا جارہا ہے۔ ایسے بے شمار واقعات منظر عام پر آئے ہیں جب گرفتار کئے گئے یا مشتبہ فرد کے خاندان کی خواتین کو جنسی ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔

اپریل کے آخری ہفتہ میں سیکورٹی فورسز نے جنوبی کشمیر کے کم از کم نو دیہاتوں میں گھر گھر تلاشیاں لیں۔ اسی تلاشی آپریشن کے دوران نوپورہ گاؤں میں سیکورٹی اہلکاروں نے ایک ٹیچر محمد ایوب لون کی بیوی کو اس کے مکان میں اکیلا پایا۔ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جوانوں نے اس خاتون کا منہ بند کردیا اور اس کے سارے کپڑے اتار دیئے اور اس کے ساتھ اس وقت تک اپنا منہ کالا کرتے رہے جب تک بے ہوش نہیں ہوگئی۔ حسب معمول پولیس نے اس جرم کی شکایت درج کرنے سے انکار کردیا۔

حال ہی میں کل جماعتی حریت کانفرنس کے سرکردہ رہنما سید علی شاہ گیلانی نے شمالی کشمیر کے دور دراز دیہاتوں کا دورہ کرنے کے بعد وہاں کی صورت حال کا بھیانک نقشہ کھینچا۔ انہوں نے بتایا کہ ہندوستانی فوج مسلح جدوجہد کو کچلنے اور عوام میں خوف کی نفسیات پیدا کرنے کے لئے وحشیانہ حربے استعمال کررہی ہے۔ ضلع کپواڑہ کے اس دور دراز علاقے میں دردپورا، گنگلوسا، چوکی بل، لون باری، کرالپورہ اور دردسن جیسے چھوٹے قریوں میں جہاں جنگل کے قانون کی حکمرانی ہے اور یہاں کے باشندے اس سے بچنے کے لئے راہ فرار بھی اختیار نہیں کرسکتے ہیں۔ گیلانی صاحب نے بتایا کہ بیشتر دیہاتوں میں فوج کے اہلکاروں نے ایک بہت بڑی زرعی اراضی پر قبضہ کر رکھا ہے اور کھیتوں میں مقامی لوگوں سے جبری مزدوری کروانا اب ایک عام بات بن گئی ہے۔ گیلانی صاحب نے بتایا کہ فوج کے ایک ڈاکٹر نے انٹروگیشن (پوچھ تاچھ) کرنے کی ایک اذیت ناک تکنیک وضع کی ہے جس کے تحت گرفتار شخص کے سب سے پہلے کپڑے اتار دیئے جاتے ہیں اور پھر اسے ایک گڑھے میں گاڑ دیا جاتا ہے کہ صرف گردن سے اوپر کا حصہ (یعنی سر) زمین سے اوپر رہتا ہے۔ اس حالت میں اسے کئی دنوں تک رکھا جاتا ہے۔ دفن کرنے سے قبل اس کے دونوں ہاتھ اور پیر مضبوطی سے باندھ دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ بھاگنے کی پوزیشن میں نہ رہے۔ انٹروگیشن کے دوران اسے بجلی کے جھٹکے اس وقت تک دیئے جاتے ہیں جب تک کہ اس سے جو کچھ پوچھا جائے وہ اس کا اقبال نہیں کرلیتا۔

پوچھ تاچھ کا یہ ظالمانہ طریقہ 1993ء کے آخر میں رائج کیا گیا۔ حریت کانفرنس کے قائد کے بقول بادم پل، ریڑی، پانز گام، آورا اور ہرای دیہاتوں سمیت ایک بڑے علاقے میں فوج اس تکنیک کا بے خوف ہوکر استعمال کررہی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ حال ہی میں پانز گام گاؤں کے تقریباً تین سو لوگوں کا انٹروگیشن اسی تکنیک سے کیا گیا۔ یہاں تک کہ سیکورٹی عملہ اس معاملہ میں خواتین کے ساتھ بھی رعایت نہیں برتتا۔ عسکریت پسندوں کو پناہ دینے کا الزام عائد کرکے سیکورٹی فورسز نے ریڑی گاؤں کی کم از کم دس خواتین کا اس اذیت ناک تکنیک سے انٹروگیشن کیا۔

اس بہیمانہ تکنیک کے شکار دیہاتیوں کے حوالے سے گیلانی صاحب نے بتایا کہ کئی کئی دنوں تک گڑھوں میں گردن تک گاڑے رکھنے کی وجہ سے ان لوگوں کو سنگین بیماریاں لاحق ہوگئی ہیں بالخصوص جسم کے اہم اعضاء بے کار ہوگئے ہیں۔ بیشتر متاثرین نے گردوں اور پیٹ میں درد اور قلب میں تکلیف کی شکایات کی ہیں لیکن سب سے زیادہ نقصان مردوں کی جنسی صلاحیت کو پہنچا ہے۔

حریت رہنما نے بتایا کہ اس دور دراز علاقے کا کبھی کسی اخبار نویس نے دورہ نہیں کیا۔ جہاں فوجیوں کی تعداد مقامی آبادی سے بڑھ گئی ہے۔

سیکورٹی فورسز نے "اسلامی دہشت گردی" کے خلاف اپنی جنگ میں خاص طور سے داڑھی والے نوجوانوں کو نشانہ بنانا شروع کردیا ہے۔ سیکورٹی عملہ کی ان چنندہ گرفتاریوں سے دیہی علاقوں میں دہشت پھیل گئی ہے۔ دیہاتیوں نے الزام عائد کیا کہ ہر جگہ باریش نوجوان سلامتی دستوں کا اولین نشانہ بنتے ہیں اور انٹروگیشن کے دوران داڑھیاں کتردی جاتی ہیں۔ خودسری نگر کے اطراف و اکناف میں واقع بعض فوجی چوکیوں میں تعینات سیکورٹی اہلکار باریش راہ گیروں کو روک دیتے ہیں اور انہیں اپنی داڑھی منڈواکر "اچھے انسان" بننے کی تلقین کرتے ہیں۔

جموں و کشمیر کے گورنر جنرل کے وی کرشنا راؤ نے ایک علیحدہ ہیومن رائٹس کمیشن قائم کرنے کا اعلان کیا لیکن اس کے باوجود کشمیر بالخصوص دیہی علاقوں میں حقوق انسانی کی صورت حال حد درجہ سنگین ہے اگرچہ ریاستی انتظامیہ نے ایڈیشنل ڈائرکٹر جنرل پولیس (انٹلی جنس) کی نگرانی میں انسانی حقوق کا شعبہ قائم کیا مگر اس کی کارکردگی سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سینٹر محض پروپیگنڈہ کے لئے قائم کیا گیا ہے اور یہ شعبہ اسی وقت حرکت میں آتا ہے جب مقامی اخبارات میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی رپورٹیں شائع ہوتی ہیں۔ ●

"...پ میں اسلام اور اسلام میں یورپ ہے"

...ے آغاز سے دنیا حیرت زدہ

مسلمانوں دونوں کو آسانی سے ایک دوسرے کے خلاف صف آراء کر دیتا ہے۔

مسلمان یوروپ میں 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں بڑی تعداد میں آئے۔ اس وقت مغربی یوروپ میں صنعتی پیداوار اپنے شباب پر تھی۔ یوروپی حکومتیں سستے مزدوروں کی خاطر شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ کی طرف دیکھنے لگیں۔ چنانچہ الجزائر، تیونس، مراکش اور ترکی سے بڑی تعداد میں مسلمان ان ملکوں میں آکر آباد ہو گئے۔ اس وقت گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا گیا تھا۔ مگر آج صورت حال بدل چکی ہے۔

1990ء کے آغاز سے جرمنی میں ترکوں کے خلاف نفرت آمیز پروپیگنڈہ جاری ہے۔ فرانس میں بھی الجزائر کی صورت حال کے پیش نظر تناؤ کا ماحول بنا ہوا ہے۔ رشدی کے خلاف فتوی اور مسلمانوں کے احتجاج کے بعد برطانیہ میں بھی مسلم مخالف فضا قائم ہے۔ ایک برطانوی خاتون اسکالر کرین آرم اسٹرانگ کہتی ہیں کہ یوں تو مغرب کی اسلام دشمنی صلیبی جنگوں کے دور سے چلی آرہی ہے۔ لیکن حالیہ دور میں اس میں اضافہ بعض دوسری وجہوں سے بھی ہوا ہے۔ آج کے یوروپ میں مسلم نوجوان بے روزگاری اور مغرب کی بعض مسلم دشمن پالیسیوں کی وجہ سے خود کو سماج سے کٹا ہوا پاتا ہے۔ ایسی ذہنی کیفیت کے انسان کو مذہبی و قومی نعروں میں ہی پناہ گاہ نظر آتی ہے۔ چنانچہ "اسلامی بنیاد پرستی" یا قومیت کی طرف یوروپ میں رہنے والے مسلم نوجوانوں کے میلان کو اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

محترمہ آرم اسٹرانگ نے اس ضمن میں مغرب کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ چونکہ ہم ایک پرسکون سیکولر تشخص قائم کرنے میں لگے رہتے ہیں اس لئے ہم دوسروں کی مذہبی سرگرمیوں کو غیر برطانوی، اجنبی اور مشکوک تصور کرنے لگتے ہیں۔ کمیونزم اور فاشزم کے زوال کے بعد بقول آرم اسٹرانگ برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک ایک نئے دشمن کی تلاش میں ہیں۔ ان کے الفاظ میں "سوویت یونین کے خلاف سرد جنگ کی جگہ اب اسلام مخالف سرد جنگ نے لے لی ہے۔ کم از کم

نفسیاتی طور پر"۔ آرم اسٹرانگ کے بقول آج کا یوروپ نئے نظریات سے خالی ہے چنانچہ خود کو مصروف رکھنے کے لئے وہ مخالفین کا ہوا کھڑا کرنے میں مصروف ہے۔

لیکن مغرب کے سیاستدانوں اور دانشوروں کے مسلم مخالف بیانات کا یوروپ کی عیسائی آبادی پر کافی اثر پڑا ہے۔ خاص طور سے ایسے بیانات سے شہ پاکر منڈھے ہوئے سر والے یا دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے انتہا پسندانہ قومیت کے علمبردار سفید فام نوجوانوں نے عام مسلمانوں کے خلاف کارروائی شروع کر دی ہے۔

گذشتہ چند سالوں میں ایسے واقعات دیکھنے اور سننے کو ملے کہ مسلمانوں کی عبادت گاہ میں سور کا سر پھینک دیا یا کسی مسجد میں آگ لگا دی۔ بعض جگہوں پر جواباً مسلمانوں نے بھی ایسے سفید فاموں کی پٹائی کر دی۔ ظاہر ہے اس سب سے یہی پتہ چلتا ہے کہ یوروپی معاشرے میں آج سماجی تناؤ اور کشمکش کی فضا قائم ہے۔

یہ ایک ایسی صورت حال ہے جو مغرب کے لئے پریشان کن ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایسی تدبیریں اختیار کرنی شروع کر دی ہیں جس سے سماجی تناؤ کو یا تو ختم یا کم کیا جا سکے۔ اس پالیسی کا ایک حصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو محض غیر ملکی مزدور سمجھنے کے بجائے انہیں یوروپی سماج کا ایک حصہ تصور کیا جائے۔ چنانچہ اس پالیسی کے تحت جرمنی نے زیادہ تعداد میں ان ترکوں کو شہریت دینا شروع کر دیا ہے جنہیں اب تک وہ "مہمان مزدور" کہتا رہا ہے۔

جرمنی کے ارباب اقتدار اب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ ترک نوجوانوں کے خلاف امتیازی سلوک کر کے جرمنی اپنے لئے مسائل ہی پیدا کر سکتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جرمنی کے کلچر اور سماج میں ترک نوجوانوں کو لانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے اندر سے احساس محرومی اور تنہائی کو ختم کیا جائے۔

فرانس پہلے ہی سے ایسی پالیسی پر گامزن ہے۔ لیکن فرانس کی یہ کوشش ہے کہ مسلمانوں کو بالکلیہ فرانسیسی کلچر میں رنگ دیا جائے۔ یعنی مسلمان نہ صرف فرنچ بولیں بلکہ اس کے کلچر اور تہذیب کو بھی اپنا لیں۔ اس کا اچھا خاصا اثر مسلمانوں پر پڑا بھی ہے۔ کتنے ہی مسلمان لڑکے لڑکیاں آج اپنی مادری زبان کی بہ نسبت فرنچ زیادہ بہتر انداز میں بولتے ہیں اور کتنوں ہی نے وہاں کی تہذیب بھی اختیار کر لی ہے۔ چنانچہ تقریباً بیس فیصد مسلم فرانسیسی لڑکیاں غیر مسلموں سے شادیاں کر لیتی ہیں۔

لیکن اس رجحان کے خلاف فرانس کے مسلمانوں میں سخت ردعمل پایا جاتا ہے۔ چنانچہ بے شمار اسلامی تنظیمیں اور مساجد تعمیر کی گئی ہیں جن کا مقصد مسلمانوں کو اپنے مذہب اور تہذیب سے برگشتہ ہونے سے روکنا ہے۔

فرانس اور جرمنی کی بہ نسبت برطانیہ نے اس مسئلے سے نبٹنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ انہوں نے بہت پہلے سے ایشیائی نسل کے لوگوں کو نسلی اور غیر مذہبی بنیاد پر قومیت دے دی ہے۔ آج 75 فیصد سے زائد برطانوی مسلمان وہاں کی شہریت رکھتے ہیں۔ ان میں بے روزگاری زیادہ ضرور ہے لیکن اسی کے ساتھ برطانوی افسران مسلم رہنماؤں سے مل کر ان کے غصہ کو ٹھنڈا کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایران کے اس بیان کو کہ وہ سلمان رشدی کے قتل کے لئے کوئی خفیہ دستہ نہیں روانہ کرے گا اور یہ کہ مغربی ملکوں کے مسلم عوام کو وہاں کے قوانین کی پابندی کرنی چاہیے، برطانیہ نے اپنے یہاں پائے جانے والے سماجی تناؤ کو ختم کرنے کے لئے بڑے پیمانے پر مشتہر کیا ہے۔

لیکن ان کوششوں کے باوجود مغربی یوروپ کے ہر سماج میں مسلمانوں اور عیسائی کے درمیان تناؤ کی کیفیت بنی ہوئی ہے۔ کیونکہ یوروپی حکومتیں مسلمانوں کو اپنی طرح مذہب بیزار بنا کر اپنی تہذیب و ثقافت کا ایک جزو لاینفک بنا لینا چاہتی ہیں جبکہ مسلم سماج کے رہنما اور علماء اپنے بچوں کے اسلامی مستقبل کے لئے فکرمند اور سرگرم عمل ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو تاریخ نے مغربی یوروپ میں ایک ایسی حالت پیدا کر دی ہے جہاں تاریخی طور پر ایک دوسرے کی مخالف دو دشمن تہذیبیں اب ایک ہی فضا میں سانس لے رہی ہیں۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ اگر دونوں تہذیبوں کے درمیان سمجھوتے کی کوئی صورت حال پیدا نہیں کی جاتی یا کوئی ایسا طریقہ نہیں ڈھونڈ لیا جاتا جس سے دونوں باہمی اعتماد اور سکون کی فضا میں سانس لے سکیں تو پھر سمجھنا چاہیے کہ یوروپ آئندہ سالوں میں بے شمار مسائل اور سماجی کشمکش کا شکار ہونے والا ہے۔ ●

فرانس میں آئندہ پندرہ سالوں میں مسلمانوں کی تعداد موجودہ 22 لاکھ سے بڑھ کر 60 یا 80 لاکھ ہو سکتی ہے۔ مسلم لڑکیاں امتناعی احکام کے باوجود اسکارف باندھتی ہیں اور مسجدوں اور نمازیوں کی تعداد میں روزافزوں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مغربی یوروپ میں مسلمانوں کی آبادی، ایک نظر میں

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق کل آبادی ۸ ملین

جرمنی	برطانیہ
2.2 ملین	1.3 ملین
ترک اور کرد مسلمان جو کبھی کام کے لئے یہاں آئے تھے اب جرمن معاشرے کا مستقل حصہ بن چکے ہیں	یہاں بیشتر مسلمان برطانیہ کی سابق کالونی سے آئے ہیں جن میں پاکستان، ہندوستان اور بنگلہ دیشی مسلمانوں کی تعداد نمایاں ہے

وہ پر شکوہ زندگی جینا چاہتی ہے اس لئے جسم بیچتی ہے

تل ابیب شہر مغربی ایشیا کا طوائف خانہ بنتا جا رہا ہے

"اسرائیلی مرد یہ کام کار میں کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ زیادہ آسان اور آرام دہ ہے۔ اس میں زیادہ وقت نہیں لگتا کیونکہ وہ نروس ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے میرے پاس زیادہ گاہک ہوتے ہیں اور میں زیادہ پیسہ کماتی ہوں"۔ یہ الفاظ ایک اسرائیلی طوائف ایلیانور نے ایک رات صرف تین گھنٹے میں بیس گاہکوں کی خدمت انجام دینے کے بعد اس وقت ادا کئے جب وہ خوشی خوشی گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ خوش اس بات پر تھی کہ اس رات اس نے اپنے اس دھندے سے کافی پیسہ بنایا تھا۔

ایلیانور پچھلے چھ سالوں سے اسرائیلی فوج میں لازمی سروس کرنے کے بعد سے بطور طوائف کام کر رہی ہے اور اس کا خیال ہے کہ وہ آئندہ چار سال تک یہ کام کرتی رہے گی۔ ایلیا نور تل ابیب یونیورسٹی میں کمپیوٹر سائنس کا کورس کر رہی ہے اور اسے فیلو شپ بھی مل رہی ہے۔ مگر چونکہ وہ زیادہ پر شکوہ انداز میں رہنا پسند کرتی ہے جس کے لئے مزید پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اس نے طوائف کا پیشہ اختیار کر لیا ہے تاکہ اسے پیسوں کی کمی نہ رہے۔

کسی بھی بڑے شہر کی طرح تل ابیب کبھی بھی طوائفوں کے وجود سے پاک نہیں تھا۔ لیکن گذشتہ پانچ سالوں میں یہاں گویا طوائفوں کا سیلاب آگیا ہے۔ یہ صورت حال خاص طور سے سوویت یونین کے زوال کے بعد وہاں سے یہودیوں کی بھاری تعداد اسرائیل میں آنے کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ کتنے تو ایسے ہیں جو کہ یہودی نہیں ہیں لیکن اس "فائدہ مند" تجارت کی خبر پاکر جھوٹے کاغذات کے ذریعہ یہودی بن کر آگئے ہیں۔ اکثر ایسے نقلی یہودیوں کو ملک بدر کر دیا جاتا ہے مگر فوراً ہی دوسری طوائفیں غیر قانونی طور پر درآمد کر لی جاتی ہیں۔ ان روسی طوائفوں کے آنے کے بعد سے تل ابیب کے ہر گلی کوچے میں طوائف پیشہ خواتین کا گویا سیلاب آگیا ہے۔ پہلے یہ کام خاموشی سے ہوتا تھا مگر اب دھڑلے سے ہو رہا ہے جس کی وجہ سے شرفاء کے خاندان کافی پریشان ہیں اور اس ضمن میں انہوں نے ذمہ دار افسران سے شکایت بھی کی ہے۔

ان روسی طوائفوں کے آنے کے بعد سے تل ابیب کے ہر گلی کوچے میں طوائف پیشہ خواتین کا گویا سیلاب آگیا ہے۔ پہلے یہ کام خاموشی سے ہوتا تھا مگر اب دھڑلے سے ہو رہا ہے جس کی وجہ سے شرفاء کے خاندان کافی پریشان ہیں اور اس ضمن میں انہوں نے ذمہ دار افسران سے شکایت بھی کی ہے۔

تل ابیب میں طوائفوں کی کثرت کو ایک افسر نے بحران سے تعبیر کیا ہے۔ افسران اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے تل ابیب میں باقاعدہ ایک ریڈلائٹ ایریا قائم کرنے کا پلان بنا رہے ہیں۔ اگرچہ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی جماعتوں نے مذہبی بنیادوں پر اس کی مخالفت کی ہے مگر بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے مائیکل روح اس کے حامی ہیں۔ وہ پارلیامنٹ کے ذریعہ طوائف کے پیشہ کو قانونی بنانے کے ساتھ ریڈ لائٹ علاقہ بنانے کے زبردست حامی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ تل ابیب کی ہر سڑک پر طوائفوں کا گویا سیلاب آیا ہوا ہے جس سے نوع بہ نوع مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ایک ریڈ لائٹ ایریا کے قیام کے بعد پولیس کو اس مسئلے کو کنٹرول میں رکھنے میں آسانی ہوگی۔

مائیکل روح کی تجویز کی سیکولر یہودیوں نے کھل کر حمایت کی ہے، مگر بعض مذہبی رہنماؤں نے اس کی کھل کر مخالفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ تل ابیب کو مغربی ایشیا کا طوائف خانہ نہیں بننے دیں گے۔ مگر مائیکل روح نے ان مذہبی یہودیوں کو مکار کہتے ہوئے جواباً کہا کہ ان میں سے کتنے ہی یروشلم سے یہاں تل ابیب میں عیش کرنے ان طوائفوں کے پاس خود آتے ہیں۔ دراصل یہودی قانون کے مطابق طوائف کے پاس جانا ممنوع ہے لیکن اگر کوئی محسوس کرتا ہے کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تو مقدس شہر "یروشلم" سے باہر یہ کام کر سکتا ہے۔ چنانچہ بہت سے یہودی مذہبی رہنما اس کام کے لئے یروشلم سے تل ابیب آتے ہیں۔

ان یہودی طوائفوں کے فلسطینی گاہک بھی ہوتے ہیں جو ہم بستری سے قبل ان سے اسرائیلی فوج کا لباس پہننے کی درخواست کرتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ فعل نہ صرف غیر اسلامی ہے بلکہ "قوم پرستانہ مردانگی" کے اظہار کا ایک بھونڈا طریقہ بھی ہے۔

تل ابیب میں طوائف کے پیشے کو قانونی درجہ دینے کی کوشش ہو رہی ہیں

چند سال قبل تل ابیب میں بیوٹی پارلر، مساج کے مراکز اور ایسی دوسری تفریح گاہیں خال خال تھیں، لیکن اب ان سے پورا شہر بھرا پڑا ہے جہاں غیر قانونی طور پر سیکس کا کاروبار بھی ہوتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ صورت حال روسیوں کے آنے کے بعد خاص طور سے پیدا ہوئی ہے۔ ایلیانور جیسی طالبات طوائف بھی ان روسیوں سے خفا ہیں کیونکہ اگر ان کی وجہ سے ریڈ لائٹ ایریا قائم ہو جاتا ہے تو پھر انہیں آسانی سے اپنا پیشہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ کیونکہ تب انہیں کسی بھی جگہ یہ کام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی جیسا کہ آج ہے۔

چند سال قبل تل تبیب میں بیوٹی پارلر، مساج کے مراکز اور ایسی دوسری تفریح گاہیں خال خال تھیں، لیکن اب ان سے پورا شہر بھرا پڑا ہے جہاں غیر قانونی طور پر سیکس کا کاروبار بھی ہوتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ صورت حال روسیوں کے آنے کے بعد خاص طور سے پیدا ہوئی ہے۔

بقیہ عبادت گاہوں کو اڑا دینا کار ثواب ہے

بیان نے چرار شریف کے واقعہ کے راز سے پردہ اٹھا دیا ہے یعنی کہ "ہندوستان بچانے کے لئے دہشت گردوں سمیت اس تمام ڈھانچے کو ثواب کا کام سمجھ کر "اڑا دیا گیا"۔ سوئے اتفاق سے دہشت گرد وہاں سے فرار ہوگئے۔

کتنے مظلوم ہیں یہ "سوجنیہ" کہ جنتا دل، کانگریس، کمیونسٹ، مارکس وادی کمیونسٹ، بی ایس پی اور بہت سی پارٹیوں میں شامل ان کے ہی برادران ان کی بات نہیں مانتے اور مسلمانوں اور ان کے حامی ممالک سے ساز باز کئے رہتے ہیں اور یہ بے بیچارے ہیں کہ مادر وطن کی آبرو کے لئے تن من دھن سب کچھ لٹانے کے لئے تیار ہیں۔ ارے صاحب غیرت تو دنیا سے اٹھ ہی گئی ہے۔ دھرتی پر یہی مٹھی بھر لوگ تو باقی رہ گئے ہیں جن کی قدر کرنی چاہئے۔

ملاحظہ ہو کتنا سیدھا فارمولا ہے کہ کوئی مسجد، گرجا، گردوارہ یا مٹھ ہو تو اسے دوسرے مذہب، فرقے یا عقیدے کی عبادت گاہ بربریت اور دہشت گردی کا گڑھ قرار دے کر زمین بوس کر دیا جائے اور مندر ہو تو اسے بھارت ماتا کا مندر قرار دے کر وہاں کالی کرتوتوں کی پردہ پوشی کی جائے اور اس کے برعکس مسجدیں مسلم دشمنی میں بربریت کی علامتیں ٹھہرا کر توڑ دی جائیں۔ انگریز آقاؤں کی بنائی ہوئی ایک یادگار بھی توڑنے کے خیال سے جھرجھری آنے لگتی ہے جب کہ ان کے کوڑوں کے نشانات آج بھی روح پر تازہ ہیں۔ رہ گئے جوتے ہیں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

اس بحث میں پڑنا لاحاصل ہے کہ ہمارے دلوں میں محمد بن قاسم کے دل میں جلی دوزخ کی آگ بھڑک رہی ہے یا نہیں ہم اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہمیں اس سے بھی زیادہ بھڑکنے والی آگ کا نشانہ آئے دن بنایا جا رہا ہے اور تمہارا جو بھی رد عمل ہو سکتا تھا وہ اب ہمارے لئے عام تجربہ بن چکا ہے اور سنگینی کا اندازہ ہمیں خوب ہے۔ جہاں تک سوال ہے ہندوستان کے اکیسویں صدی میں مستحکم قدموں سے داخل ہونے کا تو سارے "جنیہ" یہ کان کھول کر سن لیں کہ یہ سربلندیٔ ہندوستان کو تخریب کارانہ ذہنیت رکھنے والے نام نہاد وطن پرستوں کے بل بوتے پر نہیں ملی ہے۔ اس میں ہمارا لہو شامل ہے اور اس حقیقت سے انحراف کی کسی میں جرات نہیں ہے۔ مسلمانوں کے جذبہ جہاد کی تشہیر کرکے اہل وطن کو خوف زدہ اور ان کے ذہنوں کو زہر آلود کرنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ جس دن واقعی جذبہ جہاد پر مسلمان دوبارہ ایمان لائیں گے تو ملک و قوم کے غم میں گھلے جانے والے "جنیوں" کے حلق سے پانی اترنا بھی محال ہو جائے گا۔

بقیہ ارون شوری کی جھنجھلاہٹ

ہوئے عدالت نے کہا کہ موجودہ مقدمے سے یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی فوری ضرورت پھر محسوس ہوتی ہے۔ عدالت نے اپنی بات کو یہیں تک محدود نہیں رکھا بلکہ مزید یہ ہدایت بھی کی کہ اس فیصلے کی کاپی وزارت قانون و عدل کو بھیجی جائے تاکہ اس سے متعلق کوئی فیصلہ کیا جاسکے۔ وزارت قانون میں اس فیصلے کی کاپی دس سال سے پڑی ہوئی گرد کھا رہی ہے۔ اب جسٹس کلدیپ سنگھ کو پھر حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کرانے کی ضرورت پیش آئی ہے۔

لیکن ہندوستان کی حکومت خود بہت کمزور ہے۔ ایسے فیصلوں پر اگر کوئی کارروائی نہیں ہوتی تو اس کے پیچھے بھی وہی اسباب ہیں جن سے بنگلہ دیشی دراندازوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی، جن اسباب سے جموں کے پناہ گزینوں کے سلسلے میں ہم کچھ نہیں کرتے، جن اسباب سے حضرت بل میں ہم بریانی پہنچاتے رہتے ہیں اور چرار شریف میں ہم دہشت گردوں کو فرار ہونے کا راستہ دیتے ہیں۔ پوری دنیا میں کیا ایسا کوئی اور ملک ہو سکتا ہے۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے میں کئی اہم نکتے ایسے ہیں جن کی بنا پر اسے ایک تاریخی فیصلہ گردانا جاسکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس فیصلے میں گذشتہ تین فیصلوں سے کہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ بعض اہم نکات پر عدالت عظمی کے خیالات رکھے گئے ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ یہ فیصلہ ان فیصلوں کے فوراً بعد آیا ہے جن میں سیکولرزم کی تعریف متعین کی گئی ہے۔ اس نوعیت کا پہلا فیصلہ بی جے پی حکومتوں کی برطرفی کے سلسلے میں آیا تھا جس میں تقریباً دس صفحات میں سیکولرزم کی تعریف کا تعین کیا گیا تھا۔ دوسری بار اجودھیا کے معاملے میں سپریم کورٹ سے جب رائے طلب کی گئی تو اسے صدر جمہوریہ کو واپس کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے پھر سیکولرزم پر بہت کچھ کہا۔ یہ فیصلہ اس کے فوراً بعد آیا ہے تو سیکولرزم کی کوئی اپنی تعریف کو تھوپ نہیں پائے گا۔ اس فیصلے میں صرف یکساں سول کوڈ کی ہی بات نہیں ہے بلکہ اس میں تبدیلی مذہب کے موضوع پر بھی کافی سنجیدہ اور قابل غور نکتے زیر بحث لائے گئے ہیں۔

ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ جسٹس کلدیپ سنگھ نے دو قومی نظریے پر گہری چوٹ کی ہے۔ جب اس بنیاد پر ہم ملک کی تقسیم کر چکے تو اب جو اس ملک میں رہ رہے ہیں تو ان کے لئے ایک ہی قانون ہونا چاہئے۔

حالانکہ یہ بھی اس معاملہ کا ایک اہم پہلو ہے کہ عدالت نے خود ہی وزیر اعظم کے لئے ایک مدت کی تخصیص کر دی ہے مگر گذشتہ تجربات کے پیش نظر مجھے نہیں لگتا کہ اس سے کوئی بہت بڑی تبدیلی واقع ہوگی۔ آخر پچھلی دفعہ بھی تو سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے کی کاپی وزارت قانون کو بھیجی تھی۔ سوال عدالت کا نہیں۔ عدالت آنکھ بھی جس طرف اٹھا دے تو سرکار کو اسی سمت میں مصروف عمل ہونا چاہئے۔

لیکن یہاں تو سپریم کورٹ کو بھی حکومت نے اپنی تشہیر کا ذریعہ بنا رکھا ہے، کوئی بھی فیصلہ جب حکومت کے حق میں ہوتا ہے تو ٹیلی ویژن اور دیگر ذرائع ابلاغ سے اس کی خوب تشہیر کی جاتی ہے اور دوسروں پر حملے بھی کئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی فیصلہ حکومت کے حق میں نہیں ہوتا تو یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اس پر کمیٹی بیٹھا رہے ہیں غور و خوض کرنے کے لئے جیسا کہ چوہان صاحب کہہ چکے ہیں۔ تو مسئلہ صرف ایک ہی ہے کہ مرکز میں ایک نامرد حکومت ہے اور ایسی نامرد سرکار بھلا کیا کر سکتی ہے۔

میرا یہ خیال ہے کہ اگلے لوک سبھا انتخابات میں یہ ایک اہم ایشو بنے گا اور دیکھنا یہ ہے کہ کون سی پارٹی اسے ایشو بناتی ہے۔ جو پارٹی اسے ایشو بنائے گی اور جس طرح بنائے گی اسی سے اندازہ ہوگا کہ کون صحیح معنوں میں مذہبی غیر جانبداری کا حامی ہے۔

حکومت نے کشمیر کے تعلق سے سنگین غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے

قوت فیصلہ سے محروم وزیر اعظم عیارانہ سیاسی کھیل کھیل رہے ہیں

تحریر: سنیل سیٹھی

کشمیر میں روز بروز ابتر ہوتے ہوئے حالات کے لئے ہندوستان کی تمام تر ریاستیں پاکستان، غیر ملکی سراغرساں ایجنسیوں اور افغانی جنگجوؤں کو مورد الزام ٹھہرا رہی ہیں لیکن خود ان سے ہی فاش غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ یہ بات کشمیر میں 1989ء سے رونما ہونے والے واقعات اور حالیہ چرار شریف کے حادثے دونوں پر صادق آتی ہے۔ اس سنگین نکتے کی طرف معروف کالم نگار تولین سنگھ نے اپنی کتاب "کشمیر: اے ٹریجڈی آف ایررس" میں اشارہ کیا ہے۔

89-1988ء میں کشمیر میں باغیانہ رجحانات کے جڑ پکڑنے کے بعد سے پاکستان میں کئی ایسے معاملات سامنے آئے جن سے بغاوت کو بھڑکانے میں اس کے ملوث ہونے کا پتہ چلتا ہے مثلاً جنرل ضیاء کی موت، بے نظیر کا انتخاب اور بیوروکریٹک فوجی نظام سے نیم خفیہ تعلقات۔ دراصل ہندوستانی خفیہ ایجنسی کی ناکامی، ہندوستانی بیوروکریٹوں کی کوتاہ بینی، سابق گورنر جگ موہن کی ذاتی سیاست اور فاروق ــ راجیو گاندھی سمجھوتے کی درماندگی نے دہشت گردوں کو روسی مشین گنوں سے لیس ہو کر تخریبی کارروائیوں کے آغاز میں بڑی مدد کی ہے۔

عائد ہوتی ہے نیز یہ کہ وزیر اعلیٰ نے اپنے وعدے سے پھر کر انہیں کس طرح نیچا دکھایا تھا۔ حکومتیں تو اس طرح کی معذرتیں وقت گزر جانے کے بعد ہمیشہ پیش کرتی رہی ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب بحرانی حالات نے ملک کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا تو اس وقت وہ کیا کر رہے تھے۔

کشمیر کے نظم و نسق کی ذمہ داری بنیادی طور پر چونکہ وزیر داخلہ ایس بی چوان اور جموں و کشمیر کے گورنر جنرل کرشنا راؤ پر عائد ہوتی ہے اس لئے ان پر لازم تھا کہ وہ چرار شریف کو کسی قیمت پر دہشت گردوں کی جائے پناہ

ہو سکتی ہے اور ایسے میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آنا چاہیے۔

لیکن حالات قابو سے باہر ہوتے گئے۔ دہشت

> معاصر صحافت کے اس کالم میں ہم مسلم معاملات، سیاسی حالات اور دوسرے اہم موضوعات پر معروف اہل قلم اور صحافیوں کے مضامین شائع کرتے ہیں۔ یہ مضامین ہم مختلف قومی اخبارات سے منتخب کرتے ہیں۔ ان کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ قارئین دوسرے اخبارات کے قلم کاروں کے نظریات و خیالات سے واقف ہو سکیں اور یہ جان سکیں کہ دوسری زبانوں کے اخبارات مذکورہ معاملات پر کیا موقف اختیار کر رہے ہیں۔

گرد کئی گروہوں میں بٹ گئے۔ کشمیر میں خود مختار ذرائع کے مطابق یہ واضح نہیں ہے کہ 11 مارچ کو چرار شریف درگاہ میں فائرنگ کی ابتدا کس طرف سے ہوئی۔ اگر انتظامیہ کی طرف سے ایسا ہوا تو یہ حفاظتی فوجوں کی بدنظمی کی علامت ہے کہ وہ بڑے پیمانے پر دوکانوں اور مکانوں کی آتش زدگی کو روک نہ سکیں اور دہشت گردوں کو اس طرح نکل بھاگنے کا موقع فراہم کیا۔ اور اگر خود فوج نے ہی آگ لگنے میں پیش قدمی کی تو ان کا جرم اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ چھ سو سال پرانی عبادت گاہ کو محض اس مقصد سے نذر آتش کر دیا جاتا ہے کہ اس کے اندر روپوش دہشت گردوں کو گرفتار کیا جاسکے اور ستم یہ کہ اس اقدام کے باوجود فوج اپنے مذکورہ مقصد میں ناکام رہتی ہے۔

واقعات کی زیادہ تر رپورٹیں غیر واضح ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انتظامیہ نے بدنامی کے خوف سے واقعات میں ادھر ادھر کی کڑیاں ملانے میں ہی عافیت سمجھی۔ مسجد کے اندر 32 دہشت گرد تھے یا 45 اور کیا ان کے ساتھ غیر دہشت گرد بھی شامل تھے۔ کیا 800 مکانات اور 200 دوکانوں کے جلنے سے عام شہریوں کی جانیں تلف ہوئیں۔ انتظامیہ کا جواب نفی میں ہے۔ تمام ملبے سے لاشیں برآمد ہوئی ہیں۔ مرکز میں کسی

بھی تباہ کاری کے بعد سیاسی سطح پر ہونے والے لایعنی اقدامات سے ایک طرح کی بے نیازی اور غیر سنجیدگی کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ وزیر اعظم نے بھی حسب سابق مبہم اشارے ہی کئے ہیں۔ مثلاً آل پارٹی میٹنگ بلانا اور مسجد کی از سر نو تعمیر کے لئے رقم کی منظوری (گویا کہ ایک قدیم مذہبی عبادت گاہ راتوں رات کھڑی کر دی جائے گی) لیکن اتنا ضرور ہوا ہے کہ انہوں نے کوتاہیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ "کوئی بھی شخص اس سانحے کی ذمہ داری سے دست بردار نہیں ہو سکتا" اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں جا کر صحیح صورت حال کی رپورٹ حاصل کی جائے بلکہ وہ دوبارہ جموں و کشمیر کو مزید خود مختاری دینے کا گھسا پٹا نعرہ لگانے لگے ہیں اور جولائی میں صوبے میں انتخاب کروانے کے لئے اپنے عزم کا اعلان کر رہے ہیں۔ یہ آخری بات جسے اس ملک کے قوت فیصلہ سے محروم وزیر اعظم کے آہنی عزم پر محمول نہیں کیا جانا چاہئے، عیارانہ سیاسی کھیل معلوم ہوتی ہے، یعنی کہ یہ ٹی این شیشن کے کندھے پر جوا رکھنے کا بہت آسان طریقہ ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ اصل حزب مخالف اس موضوع پر کوئی نقطہ نظر نہیں رکھتا جس کا وہ اظہار کر سکیں کیونکہ چرار شریف کے مسئلہ پر اٹل بہاری باجپئی اور ایل کے اڈوانی جیسوں کی بات سنے گا کون جب کہ خود ان کا ریکارڈ مسجد شکنی کے معاملے میں پوری دنیا کے سامنے ہے۔

چرار شریف کا واقعہ نہ صرف کشمیر بلکہ پورے ملک کے لئے اس ستم رسیدہ وادی کے حالات کو برسوں پرانی لیک پر واپس لوٹا دے گا اور جو غلطی ابھی تک ہوئی ہے اسی کو دہرایا جاتا رہے گا۔ مرکزی حکومت اپنی غلطیوں کا ازالہ صرف اس صورت میں کر سکتی ہے کہ وہ اپنے لیڈروں کی نااہلی اور ناکارکردگی کا پوری طرح اندازہ کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

> غور کرنے کی بات ہے کہ چھ سو سال پرانی عبادت گاہ کو محض اس مقصد سے نذر آتش کر دیا جاتا ہے کہ اس کے اندر روپوش دہشت گردوں کو گرفتار کیا جاسکے اور ستم یہ کہ اس اقدام کے باوجود فوج اپنے مذکورہ مقصد میں ناکام رہتی ہے۔

پینے ندیدے جہاں وہ گزشتہ مارچ سے چھپے ہوئے تھے۔ خصوصاً اس وجہ سے بھی کہ گورنر کشمیر میں انتظامیہ، خفیہ خدمات اور سیکورٹی فوج کے سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کشمیر میں ایک سے ڈیڑھ لاکھ افراد پر مشتمل فوج تعینات کرنا کوئی معمولی بات نہیں

> مسئلہ یہ ہے کہ اصل حزب مخالف اس موضوع پر کوئی نقطہ نظر نہیں رکھتا جس کا وہ اظہار کر سکیں کیونکہ چرار شریف کے مسئلہ پر اٹل بہاری باجپئی اور ایل کے اڈوانی جیسوں کی بات سنے گا کون جب کہ خود ان کا ریکارڈ مسجد شکنی کے معاملے میں پوری دنیا کے سامنے ہے۔

اگر ہندوستانی حکومت کے دعووں کے مطابق کشمیر میں پاکستان کے تربیت یافتہ دہشت گردوں اور افغانی جنگجوؤں کو چرار شریف کی مسجد اور قصبے کے ایک بڑے حصے کو نذر آتش کرنے کا ذمہ دار قرار دے بھی دیا جائے تو بھی سنگین غلطیوں کا ارتکاب انتظامیہ اور حفاظتی افواج سے ہی ہوا ہے۔

یہ بہر حکومت کی ذمہ داری ہے کہ عبادت گاہوں کے تحفظ کی ضمانت دے۔ اس کا مطلب ہے کہ بابری مسجد کو 1992 میں مسماری سے بچانا مرکز کا کام تھا چاہے اسے صوبائی حکومت سے کتنی ہی سختی کے ساتھ پیش آنا پڑتا۔ بعد میں قوم کے لئے وزیر اعظم کے منہ سے یہ الفاظ سننا کوئی اچھی بات نہیں تھی کہ اس فعل کی ذمہ داری یوپی کی حکومت پر

ہے کیونکہ اگر دنیا میں نہیں تو برصغیر میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی مثال ہے۔ جنرل کرشنا راؤ نے بحران ختم کرنے کی اہمیت کو اس وقت محسوس کیا ہے جب مرکزی حکومت نے جولائی میں کشمیر میں انتخاب کروانے کے عزم کا اعادہ کیا۔ یہ ان کا کام تھا کہ طویل محاصرے کے دوران دہشت گردوں اور صلح کاروں کے درمیان بات چیت کی ناکامی کے امکانات کو دور کر لیتے۔ اپنے تجربات کی روشنی میں انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے تھا کہ 1993ء میں حضرت بل کا محاصرہ ختم کرنے کی راہ میں حائل دشواریوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد چرار شریف کے پیچیدہ محل وقوع اور دہشت گردوں کے پختہ ارادوں کے پیش نظر وہاں کی صورت حال زیادہ

میں نے اسلام خوب سوچ سمجھکر قبول کیا ہے

اپنے ناقدین کو عمران اور حائقہ خان کا دندان شکن جواب

عمران خاں کی منگنی اور شادی کی خبریں اخبارات نے کچھ اس انداز سے شائع کی ہیں کہ ان میں وہ سارا ڈرامہ، سسپنس، تناؤ اور کشمکش سمٹ آئے ہیں جو ایک روزہ کرکٹ میچوں کے آخری لمحات میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ متوقع طور پر مغربی پریس نے اپنے رنگ و نسل کی بے بنیاد برتری کے زعم میں نہ صرف عمران خان کو آڑے ہاتھوں لیا ہے بلکہ پاکستانی کلچر اور مذہب اسلام پر بھی جی بھر کے کیچڑ اچھالا ہے۔

عمران خان کی منگنی کی خبر سب سے پہلے بی بی سی ٹیلی ویژن سے نشر ہوئی۔ بی بی سی کے مطابق شادی آئندہ سردیوں میں پاکستان میں ہونی تھی مگر ایسا لگتا ہے کہ اخبارات و ٹیلی ویژن کے صحافیوں کی بے پناہ دلچسپی کے پیش نظر عمران اور حائقہ خان نے عافیت اسی میں دیکھی کہ خاموشی سے پیرس میں شادی کرلیں۔

شادی کے بعد مغربی اخبارات عمران خان کے پیچھے پڑگئے۔ یہ بات ان کے حلق سے نہ اتر سکی کہ کیسے لندن کی ایک امیر ترین اور خوبصورت ترین دوشیزہ نے اس پاکستانی سے شادی کا ارادہ کرلیا جو مغربی تہذیب کا زبردست نقاد ہے۔ انہوں نے گھوڑسواری اور کلبوں کی دلدادہ جمیمہ یا حائقہ خان کو آگاہ کیا کہ پاکستان میں زندگی ایک عذاب مسلسل ثابت ہوگی۔ ان بہت ساری انگریز خواتین کے انٹرویو شائع کیے گئے جن کی مسلمانوں کے ساتھ شادیاں ناکام ہوگئی ہیں۔ ظاہر ہے دانستہ طور پر ان بے شمار خواتین کے تجربات کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی جو پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کررہی ہیں۔

مغربی اخبار نویسوں کے ساتھ بعض پاکستانی سیاستداں اور صحافی بھی عمران کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور مسلسل ان کے خلاف مضامین رقم کر رہے ہیں۔ یہ لوگ عمران کو فریبی، دغاباز اور نہ جانے ایسے کتنے ہی ناموں سے یاد کرنے کے ساتھ ان کے سیاسی مستقبل کے خاتمے کا بھی اعلان کرچکے ہیں۔

مغربی و پاکستانی صحافیوں کی بے سروپا باتوں سے پریشان ہوکر عمران خان اور ان کی بیگم حائقہ نے دو الگ الگ مضامین میں اپنی شادی کا دفاع کیا ہے۔

> میری شادی کے پیچھے یہود و نصاری کی سازش دیکھنے والے اسے ایک پاکستان کی انگریز خاتون سے شادی کے طور پر دیکھیں جس نے اپنا مذہب تبدیل کرلیا ہے اور جو پاکستان میں رہنا چاہتی ہے۔ — عمران خان

عمران خان کا مضمون پاکستان کے ایک اخبار میں شائع ہوا جس میں انہوں نے اپنے ناقدین کو جی بھر کے کوسا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ مغربی اخبار نویسوں سے انہیں کسی بہتر سلوک کی توقع نہیں تھی مگر پاکستانی صحافیوں کے رویے سے انہیں تکلیف پہنچی ہے۔ انہوں نے الزام لگایا کہ یہ وہی صحافی اور سیاستداں ہیں جو ابھی کچھ دنوں پہلے تک یہ لکھ رہے تھے کہ عمران بہت جلد میدان سیاست میں کودنے والے ہیں اور اب اس کی سیاسی موت کے تعزیت نامے لکھنے میں مصروف ہیں۔

عمران نے مزید کہا کہ کم ازکم اس شادی سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ پاکستانی سیاست میں شریک ہونے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

عمران نے اپنے مذہبی ناقدین کو بھی کھری کھری سنائی ہے۔ انہوں نے کہا کہ مغرب کی تنقید کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ کسی مغربی لڑکی سے شادی نہ کی جائے۔ اگر کوئی لڑکی اسلام قبول کرلے، اپنے مذہب اور وطن کو چھوڑ کر پاکستان میں رہنے پر آمادہ ہے تو اس سے اسلامی طریقے سے شادی کرنے پر واویلا ان کی فہم سے بالا ہے۔ لوگوں کو سوچنا چاہئے کہ عمران نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا ہے بلکہ ان کی بیوی نے ایسا کیا ہے اور اس اقدام کے لئے ان کی ہمت افزائی کی جانی چاہئے۔ عمران نے مزید کہا کہ وہ دل سے کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کے خواہشمند تھے مگر شاید قسمت میں لکھا وہ کچھ تھا جو واقع ہوچکا ہے۔ انہوں نے اپنے ہم وطنوں سے اپیل کی کہ وہ اس شادی کے پیچھے یہود و نصاری کی سازش دیکھنے کے بجائے ایک پاکستانی کی ایک انگریز خاتون سے شادی کے طور پر دیکھیں جسے ان کے والد اور بہنوں نے تہ دل سے قبول کیا ہے اور پورے پاکستان کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔

اسی دن سنڈے ٹیلی گراف میں جمیمہ یا حائقہ خان کا بھی ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے نہ صرف اپنی شادی کا بلکہ اپنے شوہر کا بھی دفاع کیا ہے۔ انہوں نے مغربی صحافیوں کو اس بات کے لئے آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ انہیں ایک کم عقل، جذباتی اور سادہ لوح انسان سمجھ کر لوگوں کے سامنے یہ تصویر پیش کررہے ہیں کہ انہوں نے جلد بازی میں ایک غلط فیصلہ کیا ہے جس پر بہت جلد وہ پشیمان بھی ہوں گی۔ انہوں نے مغربی تہذیب پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ بدن کی نمائش کرنے والے ملبوسات، کاک ٹیل پارٹیاں اور کلب وغیرہ خوشی کا سامان نہیں ہیں۔ زندگی ان باتوں کے علاوہ بعض دوسری اقدار سے بھی عبارت ہے۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ انہوں نے اسلام بے سوچے سمجھے نہیں قبول کیا بلکہ غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ اس مذہب میں سچی خوشی پنہاں ہے۔ انہوں نے اپنے ناقد صحافیوں سے سوال کیا کہ جس انداز سے وہ لوگوں کے سامنے انہیں عمران خان سے شادی کے بعد پیش کر رہے ہیں اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ مغربی خاتون کی آزادی و خوشی بس یہ ہے کہ اسے باریک و مختصر لباس، شراب اور نائٹ کلبوں میں تفریح کی اجازت ملی ہوتی ہے۔ حائقہ خان نے زور دے کر کہا کہ ان خرافات سے پرے بھی زندگی ہے۔ انہوں نے یہ امید بھی ظاہر کی کہ عمران خان کے ساتھ پاکستان میں وہ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہوں گی۔

> بدن کی نمائش کرنے والے ملبوسات شراب نوشی کی پارٹیاں اور کلب وغیرہ خوشی کا سامان نہیں ہیں۔ زندگی ان کے علاوہ دوسری اقدار سے عبارت ہے سچی خوشی اسلام میں ہے اور میں نے سوچ سمجھکر اسلام قبول کیا ہے۔ — حائقہ خان

بھدرک کے مسلم طلباء کے مستقبل کے کھلواڑ کا ذمہ دار کون؟

بھدرک صوبہ اڑیسہ کا ایک ایسا شہر ہے جہاں کثیر تعداد میں مسلمانوں کی آبادی ہے۔ یہ شہر دس سال قبل ضلع میں تبدیل ہوچکا ہے۔ اسی شہر میں ایک قدیم ہائی اسکول ہے جو 1908ء میں قائم ہوا اور نارائن چندر ہائی اسکول کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ طلباء و طالبات یہاں دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کرتے چلے آرہے ہیں۔

اس ہائی اسکول میں مسلمان طلباء و طالبات کثرت سے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مگر افسوس دس سال قبل ہائی اسکول کے جو حالات تھے وہ دن بدن بگڑتے جارہے ہیں۔ دس سال قبل مسلمان طلباء و طالبات کی تعداد کم تھی لیکن محنت و لگن سے وہ لوگ اچھی پوزیشن رکھتے تھے۔ لیکن آج تعلیم حاصل کرنے کے لئے اس ہائی اسکول میں والدین حضرات اپنے بچوں کو داخل کراتے ہیں مگر ان کی تعلیم کے سلسلے میں بالکل لاپرواہ رہتے ہیں۔ جتنے مسلمان طلباء و طالبات داخلہ لیتے ہیں ان میں چند ہی کامیابی کے عروج کو پہنچتے ہیں۔ وجہ دریافت کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ ذمہ داران اپنے بچوں کو داخلہ دلانے کے بعد روپوش ہوجاتے ہیں۔ پھر پلٹ کر بھی اپنے بچوں کے متعلق پوچھتے نہیں۔ حالیہ اساتذہ میں چند بہتر تربیت سے درس دیتے ہیں باقی کا کچھ پتہ نہیں۔ کچھ اساتذہ کے رٹائرڈ اور ٹرانسفر ہوجانے کی وجہ سے اب تک وہ جگہ خالی ہے جو پر نہیں کی گئی۔ اس بات پر نہ گذشتہ سرکار اور اب نہ نئی سرکار نے توجہ دی۔ ذہن نشین رہے کہ جب تک ہم غفلت کے بستر کو خیرباد کہہ کر بیداری کی روشنی کو تلاش نہیں کریں گے تب ترقی ہمارے لئے دن میں دیکھنے والے خواب کی طرح اور تنزلی ہمارا آئینہ بن جائے گا۔

ایس۔ کے۔ نور مجسم

بھدرک (اڑیسہ)

کیالالو یادو واقعی مسلمانوں کے مسیحا ہیں؟

بہار کی سیاسی تاریخ میں مسلسل پانچ برسوں تک حکومت کرنے والے دوسرے وزیراعلیٰ لالو یادو پھر سے بہار کے وزیراعلیٰ کی کرسی پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ ان کی اس سیاسی فتح میں مسلمانوں کا کلیدی رول رہا ہے۔ مسلمانوں نے لالو یادو کو اپنا مسیحا سمجھ کر وزیراعلیٰ کی کرسی تک دوسری بار بھی پہنچادیا۔ لیکن کیا لالو یادو واقعی مسلمانوں کے مسیحا ہیں؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لئے گذشتہ پانچ برسوں کی لالو سرکار کے کاموں پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لالو یادو کام کے مسیحا کم اور نام کے مسیحا زیادہ رہے ہیں۔ لالو یادو الفاظ کی تراش و خراش اور مخصوص ڈرامائی انداز سے مسیحا تو بن گئے مگر ماضی کا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ وزیراعلیٰ بننے کے بعد انھوں نے بھاگل پور کے شہداء کے وارثین اور زخمیوں کو معاوضہ دینے اور بھاگل پور کے فسادیوں کو سزا دینے کا وعدہ کیا۔ مگر وزیراعلیٰ نے نہ تو آج تک پورے حق داروں کو معاوضہ ہی دیا اور نہ فساد میں ملوث اپنی برادری کے 800 نامزد ملزموں کو سزا ہی دلوائی۔ بلکہ نمک چھڑکنے کا کام یہ کیا کہ اس فساد کے ملزموں کے سرغنہ کامیشور یادو کو اپنی پارٹی میں شامل کرلیا۔ ساتھ ہی اس فساد کی تحقیق کے لئے جو کمیشن بنا اس کی سرکار نے کوئی مدد نہ کی اور جس انکوائری رپورٹ کو تین مہینہ کے اندر پیش کرنے کا وعدہ لالو یادو نے کیا تھا وہ رپورٹ اب پورے پانچ برسوں کے بعد سامنے آئی ہے۔ اس رپورٹ پر لالو جی کیا کرتے ہیں بہار کے مسلمانوں کو اس کا شدت سے انتظار ہے۔

مسلمانوں کے مسیحا ہونے کا دعویٰ کرنے والے لالو یادو نے مدارس ملحقہ کے علماء کی تنخواہ پورے ایک سال تک روکے رکھی یہی نہیں ان کی سرکار میں ایک بھی نئے مدرسہ کو منظوری نہیں ملی۔ لالو یادو نے مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کھولنے کا بھی وعدہ کیا مگر آج تک نہیں کھولا۔ بدھا ڈینٹل کالج کو منظوری تو دے دی مگر مسلم اقلیت کے ادارہ کٹیہار میڈیکل کالج و مولانا ابوالکلام آزاد انجینئرنگ کالج کو منظوری نہ دی۔

ان ہی کی سرکار میں ٹی بی سنٹرس کے آٹھ ہزار مسلم ملازمین کو نوکریوں سے نکال دیا گیا۔ گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ و دیگر لائبریریوں کو پانچ کتابوں کی خریداری کے لئے بھی پیسہ نہیں دیا گیا۔ امام گنج، ڈمریا کے علاقوں میں تین سو سے زیادہ مسلمانوں کا قتل ہوا۔ مگر مسلمانوں کے مسیحا انہیں دیکھنے تک نہ گئے معاوضہ تو دور کی بات رہی۔ سیتامڑھی فساد کے متاثرین آج بھی گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں مگر کوئی پرسان حال نہیں ہے۔

دنگا مخالف فورس بنانے کی بات بھی ہوائی ہی ثابت ہوئی نہ سپاہیوں، حوالداروں اور نہ داروغہ کی بحالی میں مناسب نمائندگی ملی اور نہ ٹیچرس کی بحالی میں۔ مسلمانوں کے مسیحا نے مدارس کے سرٹیفیکیٹ کی بحالی میں مناسب نمائندگی ملی اور نہ ٹیچرس کی بحالی میں مسلمانوں کے مسیحا نے مدارس کے سرٹیفیکیٹ والوں کو کوئی اہمیت دی یونانی ڈاکٹروں کی سیٹ کم کر کے آیوروید والوں کو دیں مختصر یہ کہ لالو پرشاد یادو واقعی مسلمانوں کے مسیحا ہیں ایسا نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ دیگر سیاسی پارٹیوں کے سربراہوں کی بہ نسبت مسلمانوں کو بہترین انداز میں بے وقوف بنانے اور سبز باغ دکھلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ساتھ ہی ان ساری باتوں کے باوجود اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایسے وقت میں جب کہ دیگر سیاسی پارٹیوں نے مسلمانوں کو بڑے بڑے دھوکے دیے ہیں، لالو پرشاد یادو کی گفتگو جو کہ محبت سے لبریز ہوتی ہے مسلمانوں کو حقیقی مسیحا کی گفتگو لگتی ہے یا لالو پرشاد خود مسیحا لگتے ہیں تو کوئی غلط بات بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ آئندہ پانچ برسوں میں لالو یادو سے مسلمانوں کو مسیحائی کی پوری امید ہے لالو یادو کیا واقعی مسلمانوں کی مسیحائی کریں گے اس کا جواب وقت ہی دے گا۔ ویسے ماضی کا تجربہ تلخ ہی ہے۔

وزیراعلیٰ بننے کے بعد انھوں نے بھاگل پور کے شہداء کے وارثین اور زخمیوں کو معاوضہ دینے اور بھاگل پور کے فسادیوں کو سزا دینے کا وعدہ کیا۔ وزیراعلیٰ نے نہ تو آج تک پورے حق داروں کو معاوضہ ہی دیا اور نہ فساد میں ملوث اپنی برادری کے 800 نامزد ملزموں کو سزا ہی دلوائی۔ بلکہ نمک مرچ چھڑکنے کا کام یہ کیا کہ اس فساد کے ملزموں کے سرغنہ کامیشور یادو کو اپنی پارٹی میں شامل کرلیا۔

محمد اشفاق عالم نفیس۔ دربھنگہ (بہار)

کانگریس انتشار کی دہلیز پر

ابتدا سے ہی کانگریس کی قیادت منووادی اعلیٰ طبقہ کے ہاتھ میں تھی اقلیتوں اور پست طبقات کا عمل دخل برائے نام تھا۔ جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد اور بھیم راؤ امبیڈکر کے گھیرے میں رہ چکے تھے اس لئے ممکن ہے وہ ذاتی حیثیت میں اپنے سیکولر اور لبرل ہونے کے دعوے میں مخلص ہوں لیکن حکومتی سطح کے اقدامات، حیدرآباد پولیس ایکشن اور اعلیٰ ملازمتوں میں مسلمانوں کی عدم شمولیت کی پالیسی کو صرف سردار پٹیل کے کھاتے میں نہیں ڈالا جاسکتا۔ ساتویں دہائی میں اندرا گاندھی کی آمرانہ روش نے کئی باصلاحیت اور مخلص کارکنوں کو کانگریس سے دور کردیا۔ مسموم اور فسطائی ذہن رکھنے والے عناصر کانگریس غالب ہوتے چلے گئے۔ اندرا گاندھی کی "منفعلانہ" کارروائیاں مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے خاتمہ اور یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی کوشش کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔ آسام میں نیلی کے مقام پر 1980ء میں مسلمانوں کے قتل عام نے فسادات کی تاریخ میں ایک نیا موڑ دیا۔ کشمیر میں براہ راست مداخلت بھی اندرا گاندھی کی غلطی تھی جس نے موجودہ کشمیر بحران کو جنم دیا۔

اب کانگریس سے اقلیتوں کی نفرت اس حد کو پہنچ گئی کہ انھوں نے انتقاماً بی جے پی اور شیوسینا کے جیتنے کی بھی پرواہ نہیں کی تو یہ فطری اور معقول بات ہے۔ نومبر کے آندھرا پردیش اور کرناٹک اسمبلی الیکشن اور فروری کے گجرات اور مہاراشٹر اسمبلی الیکشن کے نتائج نے کانگریس کو ایک محدود پارٹی کی شکل دے دی۔

اب کانگریسی رہنماؤں کو احساس ہورہا ہے اور وزیراعظم سے لے کر ہر ریاستی اور مقامی لیڈر تملقانہ اعتراف کررہا ہے کہ اقلیتیں کانگریس سے ناراض ہوگئی ہیں اور انھوں نے ہمیں سبق دیا ہے۔

اب کانگریس تقسیم ہوگئی ہے اور یہ تقسیم شاید کانگریس کو نئی زندگی نہ دے سکے اور یہ کانگریس کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہو۔

محمد محفوظ فلاحی

تامل ناڈو کے شمالی آرکاٹ میں مسلمانوں کے چرمی کارخانوں کو بند کرانے کی سازش

گذشتہ دنوں مدراس میں ہندو منانی کے دفتر میں ہونے والے بم دھماکے سے قریبی شہر آمبور (شمالی آرکاٹ، تامل ناڈو) میں کافی کشیدگی پیدا ہوگئی تھی لیکن آمبور میں مسلمانوں کی تجارت کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان دوستانہ فضا قائم ہے۔ دباغت اور چرمی جوتوں اور چرمی لباسوں کے بڑے بڑے کارخانے یہاں موجود ہیں جن کے اندر مسلمان اور غیر مسلم افراد برسر روزگار ہیں۔ غیر ممالک کو یہاں بنی چرموں کی بیش قیمت اشیاء برآمد ہوتی ہیں۔ اور کروڑوں کی تجارت ہوتی ہے۔ ان کارخانوں سے متعلق دوسری ذیلی تجارتیں بھی چل رہی ہیں۔

غیر ملکی برآمدات سے حاصل ہونے والے کروڑوں کے زر مبادلہ میں لوہا وغیرہ کے بعد چرم سازی کی صنعت کو اب تیسرا مقام حاصل ہے۔ (چند سال پہلے یہ دوسرے نمبر پر تھی)۔

چمڑے کے کارخانے کثرت سے اب تامل ناڈو کے ضلع شمالی آرکاٹ میں مرکوز ہیں۔ ان میں شہر وانمباڑی، آمبور، پرنام بٹ، میل وشارم اور رانی پیٹ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس صنعت کی باگ ڈور اب تک بیشتر مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے۔

گذشتہ چند سالوں سے اس صنعت کو زوال آمادہ کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اور ادھر صنعت کار اس کے تدارک کی تدابیر بھی کرتے رہتے ہیں۔ اب سب سے بڑا خطرہ جو اس صنعت کو لاحق ہوگیا ہے وہ ہے واٹر پولیوشن یعنی آبی آلودگی کا الزام۔ اس صنعت پر الزام ہے کہ یہ پانی کی آلودگی کا موجب بنتی جارہی ہیں۔ ان کارخانوں سے خارج ہونے والے صنعتی گندے پانی کی وجہ سے زیر زمین آب میں آلودگی شامل ہورہی ہے۔ اور اس کی وجہ سے زراعت اور لوگوں کی صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے۔ ان الزامات سے بری ہونے کے لئے اس تجارت کے بڑے بڑے صنعت کار اپنی تنظیموں کے ذریعہ امداد باہمی کی بنیاد پر صنعتی آبی آلودگی کو پاک کرنے کا ایک مشترکہ پلانٹ قائم کرنے میں لگے ہوئے ہیں اور کروڑوں کی لاگت کے ساتھ یہ کام جاری ہے۔

ہوتے ہوتے اس میں ریاستی سرکاری ادارہ Talco کو بھی شامل کرکے اس کو اس ذمہ داری میں شامل کرلیا گیا ہے اور اس کی زیر نگرانی آمبور کا ایک پلانٹ پایۂ تکمیل کو پہنچ بھی چکا ہے۔ چند ایک بڑے صنعت کار لاکھوں کی لاگت کے ساتھ خود اپنے ہی کارخانے میں انفرادی طور پر ایسے ذاتی پلانٹ لگاچکے ہیں۔ ریاستی حکومت چند سال پہلے ہی سے تامل ناڈو پولیوشن کنٹرول بورڈ کے نام سے ایک الگ محکمہ قائم کرچکی ہے اور چرم سازی کے کارخانے اسی کے کنٹرول میں آتے ہیں۔

سپریم کورٹ نے یکم مئی 1995ء کو شمالی آرکاٹ کے چنیدہ 59 کارخانوں کو یکسر بند کردینے کا حکم جاری کردیا اور اس طرح ضلعی حکام نے خود آکر ان کارخانوں کو سیل کردیا۔ نتیجتاً اب ہر کارخانہ میں کم از کم سو مزدوروں کے حساب سے کل 59 کارخانوں کے 5900 کنبے اور ان کنبوں کے ہزاروں افراد بے روزگاری سے متاثر ہورہے ہیں۔

ماحولیاتی تحفظ کے تئیں بنے ہوئے ضابطوں کے تحت ماحولیاتی آلودگی میں ملوث اداروں کے خلاف براہ راست شخصی اپیل کے آزاد حق کا فائدہ اٹھاکر ویلور کے ایک ادارہ (غالباً یک شخصی) بنام سٹیزن ویلفیئر فورم کی جانب سے دائر کردہ مقدمہ آخر یہ رنگ لایا کہ سپریم کورٹ نے یکم مئی 1995ء کو شمالی آرکاٹ کے چنیدہ 59 کارخانوں کو یکسر بند کردینے کا

حکم جاری کردیا اور اس طرح ضلعی حکام نے خود آکر ان کارخانوں کو سیل کردیا۔ نتیجتاً اب ہر کارخانہ میں کم از کم سو مزدوروں کے حساب سے کل 59 کارخانوں کے 5900 کنبے اور ان کنبوں کے ہزاروں افراد بے روزگاری سے متاثر ہورہے ہیں۔ مزید 496 کارخانوں پر تلوار لٹک رہی ہے۔ کیونکہ انہیں بھی تین مہینوں کی مہلت ملی ہوئی ہے۔ اس کے بعد نہ صرف کارخانے بند کردیے جانے کا بلکہ ہرجانہ کے اندیشہ کا بھی انہیں سامنا ہے۔

فتح پور مسلم انٹر کالج میں تعلیمی بیداری کے لئے اسکالر شپ

گذشتہ دنوں فتح پور مسلم انٹر کالج میں ملی رفاہ عام سوسائٹی کے زیر اہتمام مسلم طلبہ و طالبات میں تعلیمی بیداری لانے اور معاشرہ کی پسماندگی کو دور کرنے کے لئے "پرنسپل ریاض الدین احمد اسکالر شپ اسکیم" و "تقسیم انعامات" کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں دانشور اور تعلیمی و ملی تحریکوں سے وابستہ افراد نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

واضح ہو کہ یہ اسکیم سال رواں سے ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ کا امتحان امتیازی نمبر حاصل کرکے پاس کرنے والے مسلم طلبہ و طالبات میں تعلیمی رجحان بڑھانے کے لئے شروع کی گئی ہے۔

جلسہ کی صدارت جانے مانے ادیب و افسانہ نگار جناب ضیاء حسنی صاحب نے کی۔ جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر سینیئر ایڈوکیٹ جناب محمد معین الدین صاحب نے شرکت کی۔ اور نظامت کے فرائض جناب وقار عزیز صاحب نے انجام دیے۔

منجانب
ملی رفاہ عام سوسائٹی
چھوٹی بازار، فتح پور (یوپی)

مناسب رشتے

1۔ اورنگ آباد / بمبئی میں مقیم سنی گھرانے کی مذہبی لیاقت مند، خوبصورت، صاف رنگت کی بی ایڈ کی طالبہ (عمر 23 سال قد 150 سینٹی میٹر) کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ خوشحال گھرانے کے ترجیحاً ایس آئی او / ایس آئی ایم / تبلیغی جماعت سے مانوس مہاراشٹر یا سعودی عرب میں مقیم نوجوان سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 188

2۔ اعلیٰ خاندان کے کانونٹ کی تعلیم یافتہ، گریجویٹ، لیاقت مند، سلیق شعار، خوبصورت لڑکی (عمر 35 سال، قد 5 فٹ 7 انچ) کے لئے اعلیٰ اور مہذب خاندان کے چالیس سے 48 سال شخص سے رشتہ درکار ہے۔ فراق رسیدہ اور طلاق شدہ حضرات بھی رجوع کرسکتے ہیں۔ ضروری تفصیل کے ساتھ بشرط واپسی تصویر بھی ارسال فرمائیں۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 189

3۔ کانونٹ کی تعلیم یافتہ، اسمارٹ اور خوبصورت سنی گریجویٹ لڑکی (عمر 24 سال، قد 5 فٹ 2 انچ)، باروزگار گریجویٹ سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 190

4۔ ایک مشہور فرم میں ایکزیکٹو کے عہدے پر فائز کانونٹ کی تعلیم یافتہ مذہبی رجحان کی گریجویٹ لڑکی (عمر 27 سال، قد 150 سینٹی میٹر) سنی خاندان کے لڑکے سے رشتہ درکار ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 191

5۔ غیر ممالک کا سفر کرچکنے والی خوبصورت، کامرس، گریجویٹ لڑکی (عمر 3 سال، قد 5 فٹ 6 انچ) کے لئے خوشحال، مہذب اور روشن خیال خاندان کے لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 192

6۔ بمبئی میں سنی خاندان کی ایم ڈی فرسٹ ایر کی خوبصورت طالبہ (عمر 25 سال، قد 158 سینٹی میٹر) کے لئے موزوں رشتہ مطلوب ہے۔ ڈاکٹر کو ترجیح دی جائے گی۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 193

7۔ مشہور ایر لائن میں ملازم سنی خاندان کی کانونٹ کی تعلیم یافتہ، خوبصورت، دراز قد (عمر 29 سال) لڑکی کے لئے موزوں رشتہ درکار ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 194

8۔ سنی (میمن) خاندان کی ایم بی بی ایس لڑکی کے لئے (عمر 22 سال، قد 165 سینٹی میٹر) جو ریزیڈنسی ہاؤس پوسٹ بھی کررہی ہے اور جس کے خلیجی ممالک میں تقرری کے بھی امکانات ہیں۔ اعلیٰ اور مہذب خاندان کے ترجیحاً ڈاکٹر / انجینئر / ایم۔ بی۔ اے / کمپیوٹر پروفیشنل سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 195

9۔ اچھے خاندان کی حد درجہ خوبصورت اور تعلیم یافتہ لڑکی (عمر 29 سال، قد 170 سینٹی میٹر) کے لئے بزنس یا ملازمت سے وابستہ روشن خیال 28 سے 32 سال کے لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 196

10۔ بمبئی میں مقیم سنی خاندان کی انگلش میڈیم سے پڑھی ہوئی پوسٹ گریجویٹ لڑکی (عمر 26 سال، قد 5 فٹ 3 انچ) بزنس یا ملازمت سے وابستہ اچھے خاندان کے 35 سالہ لڑکے سے رشتہ درکار ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 197

11۔ خوبصورت اور گوری رنگت کی فلم سنگر لڑکی کے لئے (عمر 25 سال، قد 153 سینٹی میٹر) جس کی آمدنی دس ہزار روپئے ماہانہ ہے متمول اور معزز خاندان کے اعلیٰ ملازمت یا بزنس سے وابستہ لڑکے سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 198

12۔ گجراتی، سنی خاندان سے تعلق رکھنے والی بمبئی کی تہذیب میں پلی ہوئی، خوبصورت لڑکیوں کے لئے، جن میں سے ایک کی عمر 25 سال، قد 155 سینٹی میٹر، تعلیم بی کام ہے اور دوسری کی عمر 22 سال، قد 157 سینٹی میٹر اور تعلیم بی ایس سی مع کمپیوٹر ہے موزوں رشتے درکار ہیں۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 199

13۔ مہذب اور تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھنے والے دہلی کی ایک معروف کمپنی میں ایکزیکٹو (عمر 26 سال، قد 170 سینٹی میٹر) کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حسین لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 200

14۔ یوپی کے سنی خاندان سے تعلق رکھنے والے گلف میں سی اے کی حیثیت سے ملازم لڑکے (عمر 23 سال، قد 164 سینٹی میٹر) کے لئے جس کی ماہانہ آمدنی تیس ہزار روپئے ہے، معزز خاندان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔ رابطہ ملی ٹائمز باکس نمبر 201

15۔ سنی سید خاندان سے تعلق رکھنے والی دو لڑکیوں عمر 30 سال، ایم۔ اے، اردو اور عمر 25 سال ایم۔ اے۔ اردو کے لئے رشتے مطلوب ہیں، اترپردیش کے رہنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

مسٹر عمران
B۔159 جیون نگر، جیون اسپتال کے پیچھے،
نئی دہلی 14

16۔ ایک اعلیٰ تجارتی خاندان سے تعلق رکھنے والے خوبصورت اور خوب سیرت سنی علیگ، لکچرار (گورنمنٹ کالج مالیر کوٹلہ، پنجاب) رنگ گورا، عمر 28 سال، قد 5 فٹ 7 انچ کے لئے ایم بی بی ایس یا پی ایچ ڈی لڑکی سے رشتہ مطلوب ہے۔ خط و کتابت جلد کریں۔ لڑکی کی تصویر اور پورا پتہ بھی ارسال کریں۔

محمد عرفان فاروقی
محلہ مقبریان والا I/S سرہنڈی گیٹ
مالیر کوٹلہ، پنجاب۔ 148023

شرح اشتہار

اس کالم کے تحت شائع ہونے والے اشتہار کی شرح حسب ذیل ہے۔

اندرون ملک فی اشتہار	100 روپئے
بیرون ملک فی اشتہار	10 امریکی ڈالر

اشتہارات کی اشاعت کے جواب میں آنے والے خطوط ہم پوری مستعدی سے بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک آپ کی خدمت میں ارسال کردیتے ہیں۔

اشتہار کے ساتھ مطلوبہ رقم "ملی ٹائمز انٹرنیشنل" کے نام بذریعہ ڈرافٹ پیشگی آنا ضروری ہے۔

بوسنیا پر صلیبی درندوں کی خوفناک یلغار

یوروپ کے عین قلب میں ایک آزاد مسلم ریاست کا وجود اب خطرے میں نظر آنے لگا

بوسنیا میں سرب درندوں کی بربریت اپنی تمام تر قہر سامانیوں کے ساتھ چوتھے سال میں داخل ہوگئی ہے۔ گو کہ آج بوسنیا کی جنگ نئے دور میں داخل ہوگئی ہے اور سرب درندوں کی بندوقوں کا دہانہ بوسنیائی مسلمانوں کی جانب سے ہٹ کر اقوام متحدہ کی امن بردار فوج کی جانب مڑ گیا ہے اور وہ جنگ جو سرب باغیوں اور بوسنیا کے درمیان تین سال سے ہورہی تھی اب اور اقوام متحدہ کی امن بردار فوجوں اور ناٹو کے بیچ چھڑ گئی ہے لیکن پھر بھی مسلمان ہی پس رہے ہیں۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس سربیا کی افواج کا قلع قمع کرنے پر کمربستہ ہوگئے ہیں لیکن کیا واقعی وہ بوسنیائی سربوں کے لیڈر رادوواں کرازووک اور بوسنیائی صدر ملاسووک کو سزا دینے کو تیار ہیں، ایسا لگتا نہیں ہے۔ بجائے اس کے کہ بوسنیا میں دو لاکھ افراد کے قاتل کرازووک کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے، اس سے گفت و شنید کی جارہی ہے اور گیدڑ بھبکیوں کا سہارا لے کر اسے بوسنیا کو تسلیم کرلینے کو کہا جارہا ہے۔

سربیا پر تین سال سے تجارتی پابندیاں عائد ہیں، اقوام متحدہ کبھی کبھی سربیائی افواج کو درندگی بند کرنے کی تلقین بھی کرتا رہا ہے، ادھر ناٹو بھی دھمکیاں دیتا رہا ہے کہ وہ اپنی جارحیت سے باز آئیں ورنہ انہیں سنگین نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ دریں اثنا دو ہفتہ قبل سراجیو پر سربیا کی افواج کی تازہ بمباری نے ناٹو کے "صبر و ضبط کا بند" توڑ دیا اور ناٹو افواج نے پہلے میں سرب فوجوں کے اس ٹھکانے پر زوردار حملہ کردیا جہاں سرب اسلحوں کا ذخیرہ تھا، اس حملے میں کافی نقصان ہوا۔ ناٹو کی جانب سے یہ حملہ اس لئے کیا گیا کہ بوسنیا میں اقوام متحدہ نے جو "محفوظ علاقہ" قرار دے رکھا ہے وہاں سربیائی افواج نے حملہ کیا تھا جس کے نتیجے میں 76 افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ دریں اثنا سربیائی افواج نے بوسنیا کے وزیر خارجہ عرفان کے ہیلی کاپٹر پر میزائل داغ کر گرادیا جس میں وزیر خارجہ جاں بحق ہوگئے، 43 سالہ عرفان نے ایک سال قبل یہ عہدہ سنبھالا تھا اور وہ بہاچ کا فضائی سروے کررہے تھے۔ گزشتہ تین سال میں بوسنیائی حکومت کے جو عہدیدار ہلاک ہوئے ہیں ان میں عرفان سب سے سینئر تھے، اس سے قبل 8 جنوری 1993 کو بوسنیا کے نائب وزیر اعظم کو ہلاک کردیا گیا تھا۔

اسی درمیان سربیائی افواج نے اقوام متحدہ کی امن فوج کے 360 فوجیوں کو یرغمال بنا لیا اور وہ انہیں انسانی ڈھال کی شکل میں پیش کررہے ہیں، سرب لیڈروں کا کہنا ہے کہ اگر ناٹو نے مزید حملہ کیا تو ان میں سے بہتوں کی زندگی کا خاتمہ کردیا جائے گا۔ یرغمال شدہ فوجیوں میں فرانس کے فوجیوں کی تعداد زیادہ ہے، اسے خطرہ لاحق ہے کہ اس کے جوانوں کی زندگی ضائع ہوجائے گی اس لئے وہ بوسنیا میں تعینات اقوام متحدہ کی امن افواج سے اپنے فوجیوں کو واپس بلالینا چاہتا ہے، روس نے سربیائی افواج پر ناٹو کے حملے کی مذمت کی تھی لیکن امن فوجیوں کو یرغمال بنانے کے واقعہ پر اس نے بھی اپنی برہمی کا اظہار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس کا صبر و ضبط ختم ہورہا ہے اور امن افواج کے ساتھ کسی بھی قسم کی بربریت کی اجازت نہیں دی جائے گی، روس اب ایک سال کے بعد پھر ناٹو میں شامل ہوگیا ہے لیکن اس سے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ سربیا کی افواج کے خلاف سخت قرارداد یا فیصلے کی حمایت کرے گا، کیونکہ اب تک اس کا رویہ سرب حامی رہا ہے اور اس کے تعلقات سربیا کے صدر سلوبودون ملاسووک سے خوشگوار رہے ہیں۔

اقوام متحدہ کی امن افواج کو یرغمال بنانے پر یوروپی یونین اور دوسرے ممالک بری طرح بوکھلا گئے ہیں اس بحران کو ٹالنے کے لئے یوروپی یونین کے وزرائے خارجہ کی برو سلز میں میٹنگ ہوئی جس میں سربیا سے اپیل کی گئی کہ وہ یرغمال بنائے گئے لوگوں کو رہا کرے اور بوسنیا کی حکومت کو تسلیم کرلے، بصورت دیگر اسے بھیانک نتائج بھگتنے ہوں گے۔ اسی درمیان برطانیہ نے بوسنیا میں مزید فوجیں بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے جبکہ امریکہ کے صدر بل کلنٹن کا کہنا ہے کہ اگر ناٹو کی مدد کرنے کی ضرورت پیش آئی تو کانگریس سے صلاح و مشورہ کے بعد مدد کی جاسکتی ہے، جان میجر کا کہنا ہے کہ میری پوری کوشش ہوگی کہ میں اپنے فوجیوں کی صحیح سلامت واپسی کروالوں، امریکہ کے وزیر خارجہ وارن کرسٹوفر کا کہنا ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس کی اس اپیل پر غور کررہا ہے کہ بوسنیا میں اقوام متحدہ کی فوجوں کو پھر سے منظم کرنے کے لئے امریکی فوجی اڈے کو استعمال کرنے کی اجازت دے دے۔

بہرحال اس وقت بوسنیا کی صورت حال بہت نازک ہے۔ اقوام متحدہ کی کئی گاڑیوں پر سربیا نے قبضہ کرلیا ہے۔ جس کی بنا پر عدم تحفظ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ یوروپی یونین اس بحران کا حل تلاش کرنے کے لئے سربیا کے صدر سے سودے بازی میں مصروف ہے، مغربی ممالک بظاہر سربیا کو الگ تھلگ کرنے میں لگے ہوئے ہیں لیکن ان کا مقصد صرف یرغمال بنائے گئے لوگوں کو رہا کروانا ہے، ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کا کتنا نقصان ہوا اور کتنا ابھی ہورہا ہے، سیاسی مبصرین کا کہنا ہے کہ ابھی تک جب مسلمان گاجر مولی کی مانند کاٹے جارہے تھے تو مغربی ممالک کو کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن جوں ہی ان کے فوجی یرغمال بنائے گئے وہ چیخ اٹھے اور انہیں سربیائی افواج وحشی اور درندے نظر آنے لگے ہیں، یہ ممالک سربیا پر یہ دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ بوسنیا کو تسلیم کرلے لیکن بوسنیا کے حصے بخرے کرنے اور مسلمانوں کی "نسلی تطہیر" کی مہم میں یہ بھی برابر کے شریک ہیں۔

اس وقت بھی جب کہ جنگ نے دوسرا موڑ لے لیا ہے نقصان مسلمانوں کا ہی ہورہا ہے، خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ بحران کے حل ہوجانے کے بعد پھر وہی صورت حال پیدا ہوجائے گی اور بندوقوں و توپوں کے دہانے ایک بار پھر بوسنیا کی مسلمانوں کی جانب مڑ جائیں گے اور وحشت و درندگی کا بازار پھر گرم ہوجائے گا۔

مسلمان سے پہونچنے والی تکلیف پر صبر کرنا بھی عبادت ہے

اسلام صرف صالح فرد نہیں بلکہ صالح معاشرے کا قیام چاہتا ہے

اسلام ایک ایسے انسان کا تصور پیش نہیں کرتا ہے جو کسی معبد کا راہب بن کر ساری عمر عبادت میں گزار کر مرجائے اور معاشرے سے اس کا کوئی ربط نہ ہو جہاں وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے نہ کوئی اثر قبول کرے اور نہ ان پر اپنا ہی کوئی اثر چھوڑے۔ گویا کہ مسلمان کی حیثیت اجتماعی وجود کی ہے اور اس کی اجتماعیت کا اولین ثبوت یہ ہے کہ وہ ایک خاندان کا رکن ہوتا ہے جس میں رہ کر وہ بعض افراد کے حقوق ادا کرتا ہے اور دوسرے اس کا حق ادا کرتے ہیں۔ مثلاً ماں باپ نے اس کی پرورش کی اسے پڑھایا لکھایا۔ ان احسانات کے بدلے میں وہ ان کی خبرگیری کرتا ہے۔ ضعیف العمری میں ان کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کرتا ہے اور اپنے حسن عمل سے ماں باپ کے تئیں خود پر عائد ہونے والی ذمہ داری نبھاتا ہے اور اس حکم ربانی کا پوری طرح لحاظ رکھتا ہے کہ جب تمہارے والدین میں سے ایک یا دونوں بوڑھے ہوجائیں تو چاہئے کہ اپنے اطاعت کیش بازو ان کے سامنے جھکا دو اور دعا کرو کہ اے میرے رب تو ان دونوں پر اپنی رحمت کا سایہ اسی طرح کر جس طرح بچپن میں انہوں نے مجھے اپنے سایہ عاطفت میں رکھا۔
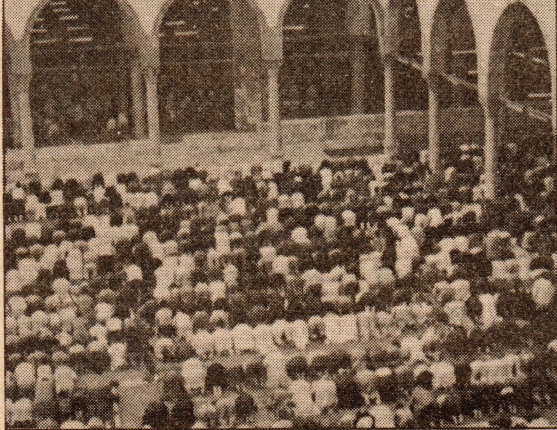
مسلمان پر اس کے بھائی بہن اور دیگر عزیز و اقارب کے حقوق ہیں تو اسی طرح اس کے حقوق ان عزیزوں پر ہیں۔ اس لئے کہ اسلام اسے خود غرضی کی تعلیم نہیں دیتا۔

مسلمان جب رجولیت کے دور میں داخل ہوتا ہے تو اسے چاہئے کہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر ایسے مسلمان خاندان کی تشکیل کرے جو ایک وسیع و عریض مسلم معاشرے کا ایک فعال حصہ بن جائے۔ مسلمانوں کے گھر اور خاندان ہی مسلم معاشرہ اور مسلمان مرد و عورت ہی اس معاشرے کے افراد ہیں۔ عہد نبوت میں بعض صحابہ کے درمیان رہبانیت کے کسی پہلو پر بحث چھڑ گئی۔ انہوں نے چاہا کہ معاشرتی زندگی سے الگ تھلگ ہو کر اللہ کی عبادت اور صوم و صلوٰۃ میں غرق رہنے لگیں اور عورتوں کی قربت سے اجتناب کریں تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک جگہ جمع کر کے یہ نصیحت فرمائی کہ "میں تم لوگوں کو اللہ کے خوف کا احساس دلاتا ہوں اور تقوے کی تلقین کرتا ہوں لیکن میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار کرتا ہوں، جاگتا ہوں اور سوتا ہوں اور عورتوں سے شادی کرتا ہوں پس جو میری سنت سے منہ موڑا وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ اسلام میں رہبانیت یعنی ترک دنیا کی گنجائش نہیں ہے۔ بہت سی احادیث ایسی آئی ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی کرنے کی تلقین کی ہے۔

مسلم معاشرے کو مسلمان نوجوانوں کی شادی بیاہ کے معاملے میں مدد کرنی چاہئے تاکہ سایہ ازدواج میں وہ اس سکون، مودت اور رحمت سے فیض یاب ہو سکیں جس کا ذکر اللہ نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

> اسلام مومن سے اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ معاشرتی اختلاط سے فرار کی راہیں نہ ڈھونڈے۔ امام احمد، امام بخاری اور ابن ماجہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ مومن جو لوگوں سے اختلاط رکھتا ہے اور ان سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کرے وہ اس مومن سے بہتر ہے جو لوگوں سے ربط ضبط نہ رکھتا ہو اور ان سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر نہ کرتا ہو۔

جب مسلمان مرد اور عورت رشتہ ازدواج میں منسلک ہوتے ہیں تو دونوں پر ایک دوسرے کے تئیں بعض فرائض اور حقوق واجب ہوتے ہیں اور ان حقوق کی رو سے مرد تو قوامیت کے درجے پر فائز ہوتا ہے اور عورت کو گھر کی نگراں کا منصب ملتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد باری ہے۔ الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض و بما انفقوا من اموالھم (النساء:34)

ایک مسلمان جو اپنے خاندان کا فرد ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرے کا بھی ذمہ دار فرد ہے نہ ہی وہ معاشرے کی طرف سے عائد ذمہ داریوں سے دست بردار ہو سکتا ہے اور نہ ہی ایسا کرنا اس کے لئے کسی طرح جائز ہے۔ اسی احساس ذمہ داری کے تحت وہ معاشرے سے اگر کچھ لیتا ہے تو اسے کچھ دیتا بھی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ صرف معاشرے سے فائدہ تو اٹھائے لیکن اسے کوئی فائدہ نہ پہنچائے اس کے وسائل سے فیض یاب ہو اور اس کے پیداواری عمل میں اپنی شمولیت سے گریز کرے۔ اسلام نے بنیادی طور پر مسلمان کے دل اور اس کے عقل و شعور میں اجتماعیت اور اجتماعی ضرورتوں کے احساس کو اس قدر راسخ و مستحکم کردیا ہے کہ اگر وہ اپنے گھر کے کسی کونے میں نماز پڑھ کر اللہ سے دعا کرے گا تو یہی کہے گا کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ گویا کہ اس نے اپنی دعاء میں اپنے ساتھ اپنے لواحقین، اہل خاندان اور معاشرے کے دیگر افراد سب کو شامل کرلیا اور اپنے ساتھ سب کی ہدایت اور توفیق کی دعاء کی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالی نے اس اجتماعیت کے پہلو کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے کہ اللہ کے احکام کے نفاذ میں بھی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح لوگ اجتماعیت کا ثبوت دیں۔ مثلاً تادیب و سزا کا نظام وضع کرنے اور حدود اللہ کے قیام میں، تاکہ حاکم و محکوم دونوں کو اس کا احساس ہو سکے کہ اللہ تعالی کے احکام کا نفاذ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ذمہ داری ہے اور اس اعتبار سے کوئی بھی اس سے چشم پوشی نہیں برت سکتا۔ اسی لئے کسی مسلمان کو برائی کی راہ پر جاتے ہوئے دیکھ کر دوسرے مسلمان کو چاہئے کہ اسے تنبیہ و نصیحت کرے اور اس برائی کی مضرتوں سے اسے آگاہ کرے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تنبیہ و نصیحت میں لوگوں کے انداز جداگانہ ہو سکتے ہیں۔

اسلام مومن سے اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ معاشرتی اختلاط سے فرار کی راہیں نہ ڈھونڈے۔ امام احمد، امام بخاری اور ابن ماجہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ مومن جو لوگوں سے اختلاط رکھتا ہے اور ان سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر کرے وہ اس مومن سے بہتر ہے جو لوگوں سے ربط ضبط نہ رکھتا ہو اور ان سے پہنچنے والی تکلیفوں پر صبر نہ کرتا ہو۔

اسلام میں صلوٰۃ جمعہ، عیدین، حج جیسے شعائر کی شرعی حیثیت کے ساتھ ساتھ ان کی اجتماعی اہمیت پر بھی یکساں توجہ دی گئی ہے۔ اور مسلمان چونکہ معاشرہ کا فرد ہے تو اپنی تمام تر ذاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے وہ معاشرہ کو فائدہ پہنچائے اور اسے ہر اس چیز سے محفوظ رکھے جو اس کے حق میں ضرر رساں ہوں۔ ایسی بہت سی احادیث ہیں جن میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ مسلمان پر صدقہ کرنا واجب ہے۔ صدقے سے مراد مال و دولت کا صدقہ نہیں ہے جس سے دولت مندوں کی تخصیص ہو نہ ہی علم کا صدقہ ہے جس سے علماء اور دینداروں کی تخصیص ہو بلکہ یہ کہ اپنی بساط بھر ہر شخص معاشرے کے لئے کار خیر کرے

عورت تنہا سفر کر سکتی ہے بشرطیکہ!

آپ کے سوال اور ان کے فقہی جوابات

گذشتہ بار جب میں نے حج کیا تو پہلی بار رمی جمار کے لئے منی میں پہنچنے پر میرے ایام کی شروعات ہوگئی۔ جس کی بناء پر میں طواف افادہ نہ کر سکی۔ میں دیگر ارکان پورے کر کے جدہ اپنے گھر واپس آگئی اور جب ایام سے فارغ ہو چکی تو چھوٹ جانے والے ارکان کی ادائیگی کے لئے پھر مکہ مکرمہ گئی۔ براہ کرم مجھے بتائیں کہ میں نے جو کچھ کیا وہ درست تھا اور کیا میرا حج قبول ہوگا۔

جواب: خواتین عازمین حج کو اس کا التزام کرنا چاہئے کہ بالفرض (بشمول یوم عرفات و قربانی) دوران حج ایام کی شروعات ہوجانے کی صورت میں ان کا حج دیگر اشخاص کی طرح ہی درست و مقبول ہو۔ کوئی عورت جو حالت ایام میں ہو وہ دیگر حجاج کی طرح بے جھجک تمام ارکان ادا کر سکتی ہے علاوہ طواف کے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے طواف کعبہ کو نماز کے مثل قرار دیا ہے فرق صرف یہ ہے کہ دوران طواف معمولی بات چیت کی اجازت ہے۔ لہذا سائلہ نے طواف و سعی کے علاوہ باقی ارکان ادا کر کے اچھا کیا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور چونکہ انہوں نے دوبارہ مکہ مکرمہ میں حاضر ہو کر معذوری کی بناء پر چھوٹ رہنے والے ارکان کی ادائیگی کرلی ہے تو ان کا حج مکمل ہوگیا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے کہ حج مقررہ مہینوں میں کیا جانا چاہئے یعنی کہ کم از کم تین مہینوں میں اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ تین مہینے شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ ہیں۔ علماء کے مطابق یہ وہ مہینے ہیں کہ اگر ارکان حج کی ادائیگی کی ابتداء کی گئی ہے تو اس کے دوران ان کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ کوئی شخص مکہ مکرمہ پہلی شوال کو پہنچا تو اگر وہ حج افراد کرتا ہے تو وہ طواف قدم کرے گا اور ساتھ میں سعی بھی۔ پھر وہ وہیں رہ کر باقی واجبات کی ادائیگی کے لئے ان کے وقت کا انتظار کرے گا جو دو ماہ بعد ہونی ہیں۔ اگر وہ حج تمتع کرتا ہے تو اسے عمرہ سے شروعات کرنی ہے جو تمام ارکان کا ایک جز ہو جائے گا۔ اسی طرح حج کے بعض ارکان یوم عرفات اور عید کے بعد بھی ادا کرنے ہوتے ہیں۔

فرض کر لیجئے کہ کوئی عورت ان مقررہ مہینوں میں عازم حج ہوتی ہے اور اس کے یہاں یوم عرفہ سے چند روز قبل ولادت ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ولادت کے کئی دن بعد تک طواف اور سعی کی حالت میں نہیں رہے گی۔ تاہم عام حالات میں حج کے ارکان معینہ تین ماہ کی مدت میں ادا کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ مقررہ وقت پر انجام پانے والے ارکان کی ادائیگی کرلی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ سائلہ کو اپنے عمل کی درستگی کا زیادہ یقین اس بناء پر ہوا ہو کہ جدہ حدود میقات میں ہے۔ حالانکہ اس بات کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر یہی بات ظہران یا ریاض میں مقیم کسی خاندان کے ساتھ بھی پیش آئے اور اگر وہ طواف افادہ اور سعی مخصوص ایام کے خاتمے پر کرلیں تو ان کا حج بھی مکمل اور مقبول سمجھا جائے گا۔

> کسی ساتھی کی ہمراہی میں سفر جس میں ایک عورت اور اس کا شوہر شامل ہو پوری طرح موزوں ہے۔ علماء نے محفوظ رفاقت سفر کو محرم کا متبادل قرار دیا ہے۔ یہ رفاقت ایک ساتھ سفر کرنے والی عورتوں کے ایک گروہ کی بھی ہو سکتی ہے یا ایک یا دو خاندانوں کے افراد کی بھی۔

ایک بات کی طرف سے احتیاط لازمی ہے۔ اگرچہ عورت رمی جمار اور بال تراشنے کے بعد حالت احرام سے نکل جاتی ہے لیکن خروج جزوی ہوتا ہے۔ احرام کی پابندی تو اس پر سے ضرور اٹھ جاتی ہے لیکن جنسی مباشرت طواف مکمل ہونے سے پہلے جائز نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوگیا تو یہ حج غیر درست سمجھا جائے گا جس کے لئے کفارہ دینا ہوگا یا اگلے سال دوبارہ حج کرنا ہوگا۔

سوال: کیا عمرہ پر روانہ ہونے سے پہلے خوشبو لگانا جائز ہے۔ نیز یہ کہ کیا جدہ میں مقیم کوئی عورت اپنی ساتھی عورتوں کے ساتھ یا تنہا عمرہ پر جا سکتی ہے اس شرط پر کہ اسی دن واپسی ہوجائے۔

جواب: ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنہا کا بیان ہے کہ حالت احرام میں اور احرام کھولنے کے بعد بھی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطر لگانے کے لئے دیا کرتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حج یا عمرہ کا ارادہ کرتے تو احرام باندھنے سے قبل کی تیاریوں میں جو کام شامل تھے وہ تھے زائد بالوں کی صفائی، ناخن کترنا، غسل کرنا اور عطر لگانا۔ احرام باندھنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس نیت کا بھی اظہار فرماتے کہ عمرہ کے لئے روانہ ہو رہے ہیں یا حج کے لئے۔ اسی طرح احرام کھولنے

بقیہ صفحہ ۱۸ پر

اپنی سے زیادہ ان کی صفائی کا خیال رکھیے

کہیں ایسا نہ ہو کہ گھریلو خادمائیں آپکے گھر کو امراض کی آماجگاہ بنادیں

بعض خاندانوں کو کبھی اس پریشان کن تجربے سے بھی گزرنا پڑتا ہے کہ عام صحت سے متعلق ہر ممکن تدابیر پر عمل کرنے مثلاً پانی ابال اور چھان کر پینے اور باہر کی پکی ہوئی چیزیں نہ کھانے کے باوجود ان کے بچے یرقان، پیچش اور آنتوں کی مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ بلکہ ایک بار تو ایسا بھی ہوا کہ ایک گھر میں عمر رسیدہ نانی جو اپنے سارے کام خود کرتی تھیں وہ ہر طرح کے امراض سے محفوظ رہیں باقی تمام افراد نے بستر پکڑ لیا۔ جب اس معاملہ پر غور و خوض کیا گیا اور خاندانی ڈاکٹر کی مدد لی گئی تو انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ گھریلو ملازمہ جسے آج کل کی زندگی میں گھر کا کھیون ہار سمجھا جاتا ہے وہ بیماری لگنے کا ایک اہم ذریعہ ہوسکتی ہے اگر وہ اپنی صفائی کی طرف سے غافل ہو یا گھر والے اس طرف اسے دھیان نہ دلائیں۔

ایک گھر کی ملازمہ اپنا کام بڑی مستعدی سے کرتی تھی جس میں کھانا پکانا، گھر صاف کرنا، برتن دھونا اور بچوں کی دیکھ بھال کرنا اس کے کام میں شامل تھے۔ اہل خانہ بہت مطمئن تھے۔ ملازمہ کو ایک بچے سے بہت انسیت تھی اور اسی لئے وہ اسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتی، اس کے کپڑے بدلتی، اسکول کے لئے اس کا ناشتہ دان بھی تیار کرتی۔ آخر ایک دن یہ عقدہ کھلا کہ گھر کی اسی مددگار کی وجہ سے گھر والوں کو معدے کی تکلیف اور جلدی بیماریاں لاحق ہوگئیں۔ اور بوڑھی نانی کے بچے رہنے کی اصل وجہ یہی تھی کہ انہوں نے ملازمہ کی چھوئی ہوئی کسی چیز سے سروکار نہ رکھا وہ اپنا کھانا خود پکاتیں اور اسی طرح برتن اور کپڑے دھونے کے کام بھی خود ہی انجام دیتی تھیں۔

شہری توسیع کے نتیجے میں چھوٹے یعنی غیر مشترک خاندان کے رجحان کی حوصلہ افزائی اور ملازمت پیشہ عورتوں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ گھروں میں ملازماؤں کی موجودگی ناگزیر ہوتی جارہی ہے اور ان کے بغیر گھریلو ذمہ داریوں کی انجام دہی کا تصور محال ہوتا جارہا ہے لیکن ایسے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں کہ چونکہ یہ گھریلو ملازم اور ملازمائیں غیر صحت مند ماحول میں رہتے ہیں اس لئے نادانستہ طور پر اپنے ساتھ بہت سے امراض لاتے ہیں اور گھر کے افراد تک منتقل کرتے ہیں۔ جلدی امراض کے ایک ماہر کا خیال ہے کہ اگر ان خادموں کی طرف سے احتیاط نہ برتی جائے تو تپ دق، ٹائیفائڈ، ہیضہ اور دیگر مماثل بیماریاں لگ سکتی ہیں کیونکہ ان میں جلدی امراض اور دیگر بیماریوں کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔

اگر نوکر کو خاندان کے ساتھ رہنا ہے تو اسے رکھتے وقت کم از کم دو جوڑے کپڑے جس میں چڈی اور بنیان بھی شامل ہیں، چادر، دری، کنگھی، صابن وغیرہ دیے جائیں تاکہ وہ شروع ہی سے ان چیزوں کے صحیح استعمال کا عادی بن سکے۔

اس لئے ضروری ہے کہ خطرہ سے بچنے کے لئے بعض احتیاطی اقدامات کئے جائیں۔ مثلاً جب کوئی خادمہ یا خادم گھر کے کاموں کے لئے رکھا جائے تو اس کے اوقات کار اور معاوضہ طے کرتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ اس کے جسم پر کسی عارضہ کے ظاہری نشانات مثلاً کسی طرح کی بدہیئتی اور جلد پر کھرنڈ تو نہیں ہیں یا اسے جسم کو بار بار کھجانے کی عادت تو نہیں ہے۔ تاہم بعض بیماریوں کا آسانی سے پتہ نہیں چلتا اور ہر گھریلو ملازم کا تشخیصی معائنہ بھی نہیں کرایا جاسکتا۔ پھر بھی بعض اصول ایسے ہیں کہ جن پر کاربند رہ کر صحت کو لاحق ہونے والے متوقع خطرات کو بڑی حد تک کم کیا جاسکتا ہے۔

اگر نوکر کو خاندان کے ساتھ ہی رہنا ہے تو اسے رکھتے وقت کم از کم دو جوڑے کپڑے جس میں چڈی اور بنیان بھی شامل ہیں، چادر، دری، کنگھی، صابن وغیرہ دیے جائیں تاکہ وہ شروع ہی سے ان چیزوں کے صحیح استعمال کا عادی بن سکے۔ آپ وقتاً فوقتاً اسے تنبیہ کریں کہ وہ اپنے جسم کو جراثیم اور جوں وغیرہ سے پاک رکھے اپنی نجی صفائی ستھرائی کا پورا خیال رکھے بڑھے ہوئے ناخن کاٹ لیا کرے اور بیت الخلاء سے آنے اور کھانا پکانے سے پہلے ہاتھ صابن سے دھوئے۔

اگر جزوقتی خادمہ رکھنا ہو تو بھی بہتر یہی ہے کہ اسے ایک جوڑا ایسا دیا جائے جو وہ کام کرتے وقت پہنے اور کام ختم کرکے جاتے وقت وہ کپڑے وہیں چھوڑ دے۔ جو وقت ضرورت دھل دیے جائیں گے۔ بچوں کے امراض کے ماہرین کی رائے ہے کہ بچوں کی نگہداشت کے لئے رکھی گئی آیا سے بچوں تک بیماری کے جراثیم منتقل ہوتے ہیں ایسی خادماؤں کے لئے ہر چھ مہینے پر جراثیم کش کورس ضروری ہے جس کے ذیلی اثرات نہیں ہوتے۔ اور اگر ممکن ہو تو ان آیاؤں کے بچوں کو بھی یہ کورس کرائے جائیں کیوں کہ اگر ان کو کوئی عارضہ ہوا تو وہ اپنی ماؤں کو متاثر کریں گے۔

بعض گھروں میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کی خادمہ کام کرتے وقت ربر کے دستانے پہن لے۔ اس سے نہ صرف اس کے ہاتھوں کی حفاظت ہوگی بلکہ کھانے پینے کی اشیاء آلودگی سے محفوظ بھی رہیں گی۔ آٹا گوندھنے، پھلوں کا رس نکالنے، سلاد کے لئے سبزی کاٹنے اور چٹنی پیسنے کے لئے دستانے بہت ضروری ہیں کیونکہ ان چیزوں کو بعد میں ابالا تو جا نہیں سکتا اسی لئے آلودگی کا خطرہ ان میں زیادہ رہتا ہے۔

کوئی وبا پھیل جانے کی صورت میں خواہ وہ ملازمہ کے علاقے میں ہو یا آپ کی رہائش کے علاقہ میں گھر کے افراد اور خادمہ سب کو حفاظتی ٹیکے لگوانے چاہئیں اور گھر کے کسی فرد کو اگر چھوت کی بیماری ہوجائے تو ملازمہ کو بھی احتیاطی دوائیں دی جانی چاہئیں۔

جہاں گھر کے لوگوں کو چھوت کی بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے مسئلے کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہئے وہیں یہ بات بھی ہے کہ یہ مسئلہ ایسا پریشان کن بھی نہیں۔ بلکہ ذاتی صفائی اور ستھرائی سے بڑی حد تک اس پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

لیکن ایسے واقعات اکثر دیکھنے میں آتے ہیں کہ چونکہ یہ گھریلو ملازم اور ملازمائیں غیر صحت مند ماحول میں رہتے ہیں اس لئے نادانستہ طور پر اپنے ساتھ بہت سے امراض لاتے ہیں اور گھر کے افراد تک منتقل کرتے ہیں۔ جلدی امراض کے ایک ماہر کا خیال ہے کہ اگر ان خادموں کی طرف سے احتیاط نہ برتی جائے تو تپ دق، ٹائیفائڈ، ہیضہ اور دیگر مماثل بیماریاں لگ سکتی ہیں کیونکہ ان میں جلدی امراض اور دیگر بیماریوں کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔

بقیہ فقہی سوال

کے بعد بھی آپ خوشبو لگاتے تھے۔ یہاں قابل ذکر بات یہ ہے کہ احرام کی حالت میں خوشبو لگانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور چونکہ احرام کھولنے کے بعد غسل کیا جاتا ہے اور خصوصاً حج میں تو اس کے بعد ہی خوشبو لگائی جاسکتی ہے۔

عورت کے ساتھ محرم کی موجودگی حج یا عمرہ کی حرمت کی بناء پر نہیں بلکہ مسافت سفر کی وجہ سے ضروری ہے۔ عورت کا شوہر یا قریبی رشتہ دار خواہ خون کے رشتے سے ہوں یا رضاعی رشتے سے مثلاً باپ، چچا، بھانجا، بھتیجہ جن سے نکاح حرام ہو محرم کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس محرم کے وجوب کا اطلاق ہر اس سفر میں ہوتا ہے جس میں ایک دن اور ایک رات سے زیادہ کی مسافت طے کرنا درکار ہو۔ اس سے کم کے سفر کے لئے محرم کی ضرورت نہیں۔ زیر نظر صورت میں محض مسافت سفر ہی نہیں بلکہ سفر کے ساتھ منزل پر قیام اور واپسی کے لئے درکار وقت کو بھی ملحوظ رکھنا ہے۔ اگر یہ تمام مراحل ایک دن سے کم مدت میں طے ہوجاتے ہیں تو عورت تنہا سفر کرسکتی ہے۔ کسی ساتھی کی ہمراہی میں سفر جن میں ایک عورت اور اس کا شوہر شامل ہوں پوری طرح موزوں ہے۔ علماء نے محفوظ رفاقت سفر کو محرم کا متبادل قرار دیا ہے۔ یہ رفاقت ایک ساتھ سفر کرنے والی عورتوں کے ایک گروہ کی بھی ہوسکتی ہے یا

سوال: بعض لوگ میدان عرفات میں حج کے دن حج کی نیت کے بغیر جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ پہلے سے حج کرچکے ہوں اور انہیں دوبارہ حج کرنے کی اجازت نہ ملی ہو۔ بہرکیف، ان کا کہنا یہ ہے کہ چونکہ یہ ایک مخصوص جگہ پر جمع ہونے کا مخصوص دن ہے وہاں جاکر عبادت کرنا اور اللہ کی تعریف بیان کرنا کار خیر اور باعث ثواب ہے۔ آپ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں؟

جواب: عبادات کے معاملات میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر سختی سے عمل کرنا چاہئے۔ کسی کو اس بات کی آزادی نہیں دی جاسکتی کہ وہ جب چاہے کوئی نئی عبادت شروع کردے خواہ اس کی بنیاد پہلے سے موجود اسلامی اصول پر ہو یا کسی اور چیز پر۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں وہی باتیں بتائی ہیں جن سے اللہ کی رضا حاصل ہو۔ جو ہدایت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ سے ملی وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں تک پہنچا دی۔ اس لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی پابندی ہی ہمارے لئے باعث ہدایت ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہی اللہ کی خوشنودی کا بہترین ذریعہ ہے۔ کسی ایسی چیز کا عبادت میں اضافہ کرنا یہ جتانے کے مترادف ہے کہ جو کچھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا اس میں اصلاح و بہتری کی گنجائش ہے۔

عبادات کے معاملات میں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت پر سختی سے عمل کرنا چاہئے۔ کسی کو اس بات کی آزادی نہیں دی جاسکتی کہ وہ جب چاہے کوئی نئی عبادت شروع کردے خواہ اس کی بنیاد پہلے سے موجود اسلامی اصول پر ہو یا کسی اور چیز پر۔

میدان عرفات میں حاضری یقیناً حج کا اہم رکن ہے لیکن حج کے دائرہ کار کے اندر۔ اگر کوئی حج کے علاوہ دیگر دنوں میں وہاں عبادت کرنے کے لئے جائے تو اس کی یہ کوشش باعث ثواب نہیں سمجھی جائے گی کیونکہ اس جگہ کی بذات خود کوئی اہمیت نہیں ہے اور اگر واقعی عام دنوں میں اس کی کوئی تقدیس ہوتی تو اس کے متعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ضرور کچھ فرمایا ہوتا۔ اسی طرح میدان عرفات میں حاضری یا موجودگی بھی حج کے دائرہ کار کے اندر ہی ہونی چاہئے تبھی وہ باعث ثواب ہوگی۔ ارادہ حج کے علاوہ کسی اور نیت سے اس دن وہاں کی موجودگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ نیز یہ کہ ارادہ حج کے علاوہ کسی اور ارادے سے وہاں بعض لوگوں کی موجودگی کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی کہ اس طرح وہاں کے ہجوم میں اضافہ ہی ہوگا جو حجاج کے لئے صعوبت اور تنگی کا باعث ہوگا۔ لہٰذا ایسے عازمین عرفات کا عمل مقبول نہیں ہے۔

اس شمارے کی قیمت چار روپئے
سالانہ چندہ ایک سو پچاس روپئے / سو امریکی ڈالر
یکے از مطبوعات
مسلم میڈیا ٹرسٹ
پرنٹر پبلیشر، ایڈیٹر محمد احمد سعید نے
تیج پریس بہادر شاہ ظفر مارگ سے چھپوا کر
دفتر ملی ٹائمز انٹرنیشنل
49، ابوالفضل انکلیو،
جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025 سے شائع کیا
فون: 6827018

نئی کتابیں

گرونانک کے زمانے کے لوگ انہیں عملی طور پر مسلمان سمجھتے تھے

شیخ فرید ثانی کی محبت اور اسلامی ممالک کے اسفار نے انہیں اسلامی فکر سے قریب کر دیا تھا

ملی ٹائمز میں تبصرے کے لئے کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں۔ تبصرے کے لئے کتابوں کے انتخاب کا حتمی فیصلہ ادارہ کرے گا البتہ وصول ہونے والی کتابوں کا اندراج ان کالموں میں ضرور ہوگا۔ (ادارہ)

دین اسلام گرونانک جی کی نظر میں (ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو، مرتب ایس ایم شریف قریشی) اسلام کے بنیادی تصورات اور سکھ مذہب کے بانی بابا نانک کی تعلیمات کے درمیان مماثلتوں کی تلاش کی ایک کوشش ہے۔ مولف نے اسلامی عقیدہ توحید اور کتب سماویہ، ملائکہ، حیات بعد الموت اور ارکان عبادت مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسے مختلف موضوعات کے تحت گرونانک جی کے خیالات اور ان کی تعلیمات کا جائزہ لیا ہے۔ مرتب کتاب کا خیال ہے کہ چونکہ گرونانک جی کے اصل مخاطب بت پرستان پنجاب یعنی ہندو لوگ تھے اس لئے انہوں نے اسلام کے ساتھ ساتھ ہندو مذہب کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جن مذہبی اصولوں کی انہوں نے تبلیغ کی ان میں بظاہر جزوی طور پر ہندو دھرم کے بعض تصورات کی جھلک نظر آتی ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان کے اصول اسلام سے اتنے قریب تھے کہ ان کے زمانے کے لوگ انہیں عملی طور پر مسلمان ہی سمجھتے تھے۔

عبیداللہ گیانی کی تحقیقات کے مطابق نانک کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گرونانک اپنے ننھیال میں 1468ء میں پیدا ہوئے تھے اور 1533ء میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے والد کا نام بابا کلیان چند عرف کالو اور والدہ کا نام ماتا ترتیاجی تھا۔ ان کی جائے پیدائش کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے کوئی ننکانہ صاحب کو جائے پیدائش تسلیم کرتا ہے تو کوئی تلونڈی کو۔

کتاب میں مذکور شواہد کی بناء پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ گرونانک کی فکر پر اسلامی نقوش کی مندرجہ ذیل وجوہ تھیں۔

> گرونانک کے فرمودات کی روشنی میں سکھ مذہب کے بانی کی جو تصویر پیش کی ہے وہ عملاً ایک مومن کی ہے جس کی تصدیق گروجی کے کلمہ طیبہ، وحدت خاوندی، صفات الٰہیہ، رسالت، روز محشر پر ان کے ایمان اور صوم وصلوٰۃ وحج زکوٰۃ کی پابندی سے ہوتی ہے۔

ایک مسلمان فقیر نے گروجی کے والد کو ان کی پیدائش کی بشارت دی تھی۔ پیدائش کے وقت جس شخصیت نے سب سے پہلے گروجی کو اپنی گود میں لیا وہ ایک مسلمان دایہ دولتاں تھی اور انہیں نہلانے دھلانے کے بعد بسم اللہ پڑھ کر شہد چٹایا تھا۔ بچپن میں گروجی کے بیمار پڑنے پر انہیں ایک ملاجی کے پاس لے جایا گیا جنہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، علیٰ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور اللہ کے مقرب بندوں کے طفیل میں خیر و برکت کی دعا دی۔ غالباً یہی سبب ہے کہ بچپن ہی سے گرونانک جی کو مسلمانوں سے خاص لگاؤ تھا۔ اس کے علاوہ یہ کہ ان کی ابتدائی تعلیم ایک مسلمان اتالیق میر سید حسن کے ہاتھوں ہوئی تھی جو ان کے وطن میں صاحب کرامات سمجھے جاتے تھے۔ اس تربیت کے نتیجے میں قادر مطلق کے تئیں عقیدت کا جذبہ موجیں مارنے لگا اور انہوں نے توحید کی اشاعت کا ارادہ کر لیا اور کہا جاتا ہے کہ اس راہ میں دنیا جہان کا سفر بھی ایک صوفی مسلمان درویش کی تحریک اور تلقین پر ہی کیا تھا۔ شیخ فرید ثانی کی صحبت اور ان کی تعلیمات سے اثر پذیری اور اسلامی ممالک کے اسفار نے اسلامی فکر و فلسفے سے انہیں بہت قریب کر دیا تھا۔ یہ قربت اور بھی مسلم ہو جاتی ہے جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ اور دیگر مقامات مقدسہ کی زیارت کے علاوہ بابا نانک نے ایک لمبا عرصہ عراق میں گزارا تھا اور عجب نہیں کہ عراقیوں سے اختلاط کے نتیجے میں انہوں نے عربی زبان میں اتنی مہارت حاصل کر لی ہو کہ عربی زبان میں منظوم و منثور کلام پر قادر ہو جائیں کیونکہ عربی اور فارسی کی بنیاد ان کی پہلے سے تھی۔

مصنف نے سکھ مذہب کی متعدد تحقیقی کتب میں موجود تاریخی مواد اور ان میں مذکور گرونانک کے فرمودات کی روشنی میں سکھ مذہب کے بانی کی جو تصویر پیش کی ہے وہ عملاً ایک مومن کی ہے جس کی تصدیق گروجی کے کلمہ طیبہ، وحدت خداوندی، صفات الٰہیہ، رسالت، روز محشر پر ان کے ایمان اور صوم وصلوٰۃ وحج وزکوٰۃ کی پابندی سے ہوتی ہے۔ مکہ

> عبیداللہ گیانی کی تحقیقات کے مطابق نانک کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ گرونانک اپنے ننھیال میں 1468 میں پیدا ہوئے تھے اور 1553 میں ان کا انتقال ہوا

مکرمہ میں گرونانک کے قیام اور صلحاء کی صحبت اور اس سے بھی بڑھ کر عراق کو اپنی تبلیغی سرگرمی کا مرکز بنانے کا ثبوت فراہم کرنے والے ماخذ سکھ مذہب کی کتابوں میں خصوصاً اور ہندوستانی زبانوں میں عموماً ملتے ہیں اگر اس ضمن میں چند عربی ماخذ کی نشاندہی ہو سکتی تو یقیناً سکھ مذہب کی مزید بہتر تفہیم اور اسلام سے اس کی قربت کے گوشوں کی تحقیق کی نئی راہیں کھلیں گی۔

آپ کی الجھنیں

آپ اپنی والدہ کی موجودہ ذہنی حالت کو سمجھکر قدم اٹھائیں

اگر آپ کسی الجھن میں مبتلا ہیں یا کسی اہم مسئلے پر فیصلہ نہ لینے کی پوزیشن میں ہیں جس سے آپ کی زندگی کا سکون درہم برہم ہو گیا ہے تو آپ فوری طور پر ہمیں اپنے مسائل سے آگاہ کریں۔ ہم اس کالم میں آپ کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ (ادارہ)

سوال:۔۔۔ میرے والد نے میری والدہ کو طلاق دے دی تھی۔ اللہ والدہ کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے میری تربیت کی اور میری بہتر پرورش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ جب میں بڑا ہو گیا تو میں نے ایک نیک عورت سے شادی کی جس سے میرے یہاں چار بچے ہوئے۔ اللہ کی مرضی ایسی تھی کہ میری بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اب میری ماں نے ان چاروں بچوں کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی اور اپنی عمر رسیدگی کے باوجود ہر طرح سے ان کی دیکھ بھال کرتیں اور ساری ضروریات کا خیال رکھتیں۔ اس کے بعد میں نے دوسری شادی ایک پابند صوم وصلوٰۃ اور قرآن کریم کی تلاوت پر قائم عورت سے کی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد اس بیوی اور میری ماں کے درمیان اختلافات نے سر ابھارنا شروع کیا۔ اور بچوں کے ساتھ خوش معاملگی کی بناء پر میری بیوی ان کے دل اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اب وہ میری ماں سے زیادہ بیوی کے گرویدہ ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی والدہ، اللہ ان کی حفاظت کرے، بعض دفعہ ان بچوں پر سختی کرتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ بچے ہر بات میں کمال کا مظاہرہ کریں، اور انہیں ہمیشہ ایسے کام کرنے کی تلقین کرتی رہتی ہیں جو ان کے حق میں مفید ہو۔ میری والدہ اور بیوی کے درمیان اختلاف نے اس قدر شدت اختیار کر لی ہے کہ بیوی گھر چھوڑ کر اپنے عزیزوں کے پاس چلی گئی ہے اور کہتی ہے کہ جب تک تمہاری ماں میری عزت نہیں کرے گی میں واپس نہیں آؤں گی۔ ایسے میں میرے لئے سخت مشکل پیدا ہو گئی ہے کہ کیا کروں۔ آپ کوئی مشورہ عنایت فرمائیں۔

ع۔۔۔ع۔۔۔ عبدالرحمان

جواب:۔۔۔ ایسے معاملے میں جس میں کوئی شخص صریحاً اور واضح طور پر ظالم اور ناحق پر ہو وہ خود اپنے ساتھ انصاف کر کے صحیح فیصلہ پر پہنچ سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ بعض حالات میں اپنے ظلم سے نبرد آزما ہونے میں ناکام رہتا ہے اور اپنے حریف یا مخالف کے سامنے یہ اقرار نہیں کر سکتا کہ وہ خود ہی ظالم و جابر ہے۔ زیر نظر سائل کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس کے گھر میں اس کی ضعیف ماں اور بیوی کے درمیان جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہ وہی ماں ہے جس نے اسے بہت کچھ عطا کیا ہے نہ صرف اس کی بلکہ اس کی اولاد کو بھی پال پوس کر بڑا کیا ہے اور یہی سب کچھ کرتے کرتے وہ ضعیفی کے مرحلے میں پہنچ گئی ہے جہاں اب اس کے لئے ممکن نہیں کہ ہم عصر زندگی میں بہوؤں کے ساتھ معاملات کے طریقوں کو سمجھ سکے کیونکہ اس کا تعلق گذشتہ نسل سے ہے جس کے اپنے مخصوص معاملات اور حالات تھے جو اب نہیں رہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سوچتی ہے کہ گھر میں کچھ کہنے کا اختیار شوہر کی ماں کو ہی ہے اور اس کی بیوی خانہ داری کے اہم معاملات میں مداخلت کا حق نہیں رکھتی۔ ان سب عوامل میں ایسے باطل خیالات میں اس ضعیفہ کا یقین بھی ہے کہ کسی شخص کی بیوی اس کے علاوہ کسی غیر عورت سے ہونے والی اولاد سے محبت نہیں کر سکتی بلکہ ان سے ہمیشہ بغض و کینہ رکھتی ہے نیز یہ کہ باپ کی موجودگی میں تو وہ ان بچوں سے محبت جتاتی ہے اور جیسے ہی وہ پیٹھ پھیرتا ہے تو پھر ان کے ساتھ شقاوت کا برتاؤ کرنے لگتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مندرجہ ذیل باتوں کی طرف توجہ کرنے سے سائل کی مشکل آسان ہو جائے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اپنی والدہ کی موجودہ حالت کو پوری طرح سمجھیں کہ وہ اب عمر کی آخری منزل میں ہیں جہاں ان میں یہ احساس غالباً پیدا ہو چلا ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد کو اب تک بہت کچھ دیا ہے اور اس کے برعکس بہت کم پایا ہے یا بہت کم کا مطالبہ کر رہی ہیں لہٰذا وہ چاہتی ہیں کہ گھر کے معاملات میں ان کی بات کو وقعت حاصل رہے کیونکہ ضعیف العمری میں یہ خواہش زیادہ بڑھ جاتی ہے جب کہ دائرہ کار سمٹ جاتا ہے اور اسی قدر عقل بھی کمزور ہو جاتی ہے۔ اس لئے سائل کو چاہئے کہ اپنی والدہ کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرے جو ان کے مزاج کو سازگار ہو اور جس سے انہیں اپنی اہمیت و حیثیت کا احساس ہو یہاں ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ جب تمہارے سامنے تمہارے والدین میں سے کسی ایک پر یا دونوں پر ضعیفی آجائے تو ان کو کوئی سخت بات نہ کہو اور انہیں نہ جھڑکو۔ ان سے مہربانی اور کرم کی بات کرو۔ اور ان کے سامنے اپنے اطاعت کیش بازو جھکا دو اور اپنے رب سے دعا کرو کہ اے میرے رب ان پر تو اپنی رحمت کا سایہ اسی طرح کر جس طرح انہوں نے مجھے اپنے سایہ عاطفت میں رکھا میری صغر سنی میں۔ یہاں اشارہ اس طرف ہے کہ ایام طفولیت میں جس طرح کسی شخص کے ماں باپ تمام تکلیفیں اس کے لئے برداشت کرتے ہیں وہ مرحلہ ضعیفی میں والدین کو پیش آتا ہے جب ان کی اولاد کو ان کے ساتھ صبر اور لطف و کرم کا برتاؤ کرنا چاہئے۔

شوہر کو چاہئے کہ اپنی بیوی کو سمجھائے کہ اپنی ماں کی ضعیفی کا خیال کرتے ہوئے ان کے معاملے میں صبر سے کام لینے اور ان کی باتوں کا جواب درشتی سے نہ دینے کی تلقین خود اس کا دین کرتا ہے۔ بیوی ہر معاملے میں اپنے شوہر کی شریک حیات ہے یعنی کہ زندگی کی سختیوں اور تلخیوں کو برداشت کرنے میں بھی۔ اس لئے شوہر کے والدین کی اطاعت میں بھی وہ شریک ہوگی۔ اس کا ایک سماجی پہلو یہ ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے والدین کی عزت و توقیر کی بناء پر شوہر کی نظروں میں محترم تو قرار پائے گی ہی اس کے حسن اخلاق کا ذکر جب شوہر اپنے عزیزوں اور خود بیوی کے عزیزوں کے درمیان کرے گا اس سے دونوں کے درمیان مزید ہم آہنگی اور اعتماد پیدا ہوگا

ہاں یہ بات ضرور دیکھنے کی ہے کہ اگر واقعی شوہر کی ماں کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہے تو اس کے لئے بھی بیوی کو ہی الزام دیا جائے اور اس طرح ماں کے ساتھ اپنی بیوی کے نیک برتاؤ کا اعتراف بھی شوہر نہ کرے۔ کیونکہ یہ بات تو واضح ہے کہ شوہر کی والدہ اس کی بیوی کی ماں نہیں ہے اور اس پر جو بھی عزت و احترام اپنی ساس کا واجب ہے وہ صلہ رحمی اور حسن معاشرت کے تحت ہے کیونکہ اسی سے اس کے شوہر کی رضا اور خوشنودی بھی وابستہ ہے۔ اس معاملے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ آج جو عورت بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے والدین کی خدمت کر رہی ہے کل اس کی حیثیت اپنے بیٹے کی ماں کی ہوگی اور اس بیٹے کی بیوی سے وہ خوش معاملگی اور صبر و احترام کی توقع کرے گی۔

Invitation Price Rs. 4/-
16 - 30 JUNE 1995

The Milli Times International

(India's first International Urdu Weekly)

49, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025 Phone:6827018

R.N.I. No. 57337/94
RGD. DL No.-16036/95

بہن سوزن کے

مشرق کی طرف بڑھتے قدم

نیویارک میں جہاں ساحل پر اسرار طور پر پتھریلا ہوگیا ہے وہیں سمندر کا پانی ان چٹانوں سے ٹکرا کر کچھ اس انداز سے جھاگ اڑاتا ہے کہ ایک طوفان مسلسل کا گمان ہوتا ہے۔ گویا کوئی آبشار ہو جو پھٹنا چاہتا ہو، نہ تھمنے والی موجوں کے کچھ ایسے عزائم ہوں جن پر ساحل کی چٹانوں نے فوری طور پر روک لگا دی ہو۔ طوفان کے اس منظر نامے میں سوزن اکثر و بیشتر نہ جانے کس چیز کی تلاش میں بھٹکتی دکھائی دیتی ہے۔

یوں تو سوزن خود طوفانوں کے بیچ رہتی ہے کہ نیویارک کا مرکزی علاقہ مین ہیٹن شہر سے کہیں زیادہ ایک پر اسرار جزیرہ دکھائی دیتا ہے۔ جہاں بلند و بالا عمارتیں غیر معمولی طور پر اس قدر بلند ہوتی چلی گئی ہیں کہ ان میں چلنے پھرنے اور رہنے بسنے والے انسانوں کی شخصیت کچھ غیر معمولی طور پر حقیر اور مختصر سی معلوم ہوتی ہے۔ خود سوزن جس فلیٹ میں رہتی ہے وہ عمارت بلا مبالغہ اتنی بلند ہے کہ بادل اس عمارت کے بالائی حصے سے مسلسل ٹکراتے رہتے ہیں۔ لیکن آسمانوں میں رہنے والی سوزن نہ جانے کیوں زمین پر اکثر و بیشتر کچھ تلاش کرتی دکھائی دیتی ہے۔ گو اس کی زندگی کے گذشتہ چوبیس سال اسی شہر میں گزرے ہیں، لیکن اسے اس شہر میں رہنا کچھ عجیب سا احساس محرومی دیتا ہے۔

سوزن کا وجود بذات خود ایک طوفان ہے کہ اسکول سے یونیورسٹی، بازار سے گھر اور احباب کی محفلوں میں اس کی چلت پھرت نے نہ جانے کتنے دلوں میں کتنے طوفان کو جنم دیا ہے۔ لیکن ادھر کچھ دنوں سے سوزن پر گہرے تفکرات کا ایک عجیب سایہ ہے۔ گذشتہ دنوں جب جیکسن ہائٹس کے علاقے سے اس کا گزر ہوا تھا اور اسے بازار میں کچھ ایسے لباس دکھائی دیئے جس کی جڑیں اس کی اپنی تہذیب سے دور کہیں اور جاملتی تھیں، نہ جانے کیوں سوزن کو ان لباسوں میں بڑی کشش معلوم ہوئی اور تب سے اب تک ساحل کے ہر سفر میں سوزن کے جسم پر جو لباس دکھائی دیتا ہے، وہ دراصل مشرق کی اسی تہذیب کا علامیہ ہے جسے پہلی بار جیکسن ہائٹس کے علاقہ میں دیکھ کر وہ خود بخود اس کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

بلند بالا عمارتوں کے ہنگاموں سے دور وہ جب کبھی ساحل کا قصد کرتی ہے تو اس کے ہاتھ میں ایک ڈائری اور قلم ضرور ہوتا ہے۔ وہ اپنے سفر کو اور فطرت کے تعلق سے اپنی شخصیت کی تلاش کے عمل کو روحانی سفر سے تعبیر کرتی ہے۔ اور اسی لئے ساحل کی ہر زیارت اس کی ڈائری میں بڑی اہمیت کے ساتھ رقم پاتی ہے۔ جب سے اپنے روحانی سفر کے لئے سوزن نے لباس مشرق کو مخصوص کیا ہے اسے ایسا لگنے لگا ہے کہ شاید خدا اور سکون کی تلاش کا عمل اس لباس میں کچھ زیادہ آسان ہو۔ پتھریلی چٹانوں پر ننگے پیر چلنا، تھک کر بیٹھ جانا، گھنٹوں کچھ سوچتے رہنا سوزن کے روحانی سفر کے چند ایسے مظاہر ہیں جن کی تفہیم خود اس کے معاشرہ کے لئے ممکن نہیں۔ وہیں ان پتھریلی چٹانوں پر بیٹھے بیٹھے جب اس کی نظر اقوام متحدہ کے مرکزی دفتر کی عمارت پر پڑتی ہے تو اسے اکائی کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اسے مغرب کے مکر و فریب کی ایک منظم سازش سے تعبیر کرتی ہے۔ جس کے چارٹریوں تو انتہائی خوشنما ہیں لیکن عملی اعتبار سے اندرون چنگیز سے تاریک تر۔

سوزن کی ڈائری کے بیشتر صفحات بھر چکے ہیں وہ اپنے روحانی سفر کے دوران گنجان فلیٹ اور فلک بوس عمارتوں سے نکل کر پتھریلی ریتیلی چٹانوں تک آئی ہے جہاں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ٹکراتی بل کھاتی لہریں، ہر لمحہ کوئی خدائی پیغام لے کر آتی ہوں۔ دوسری طرف رنگ و نور کی دنیا سے کنارہ کش ہو کر اس نے کھلے آسمانوں اور لاانتاہی سمندر کے کنارے پناہ لی ہے۔ پھر دیکھتے دیکھتے اس کے جسم پر مشرقی لباس کی ایک دلفریب فصل اگ آئی ہے۔ گویا اس کے لئے سکون کی تلاش مشرق کے حوالے سے ہی ممکن ہے۔ لیکن شاید ابھی اس کی ڈائری میں کچھ اور بھی لکھا جانا باقی ہے کہ مشرق میں سکون و اطمینان کی جو بہار نظر آتی ہے اس کا تعلق صرف اس لباس سے نہیں بلکہ اس تہذیب سے ہے جس کے اندرون میں صدیوں کی روحانیت جذب ہوگئی ہے۔ لہٰذا جب تک ان روحانی اقدار کی تلاش ممکن نہ ہو اور جب تک مشرقی معاشرے کی طرح مغرب میں بھی الٰہی ہدایت کے ماخذ کو اولین اہمیت نہ دی جائے حقیقی سکون تک رسائی ممکن نہیں۔ محض مشرقی لباس کو اختیار کر کے سکون حاصل کر لینے کا خیال ایسا ہی ہے جیسے ہمارے معاشرے میں مغرب کی ترقی کے حصول کے خیال سے بعض لوگ مغربی ثقافت کے ظاہری پہلو کے اپنانے کو ہی کافی سمجھتے ہیں۔ سوزن کی جستجو کتنی ہی سطحی کیوں نہ ہو اس میں امید کا ایک پہلو تو ضرور ہے کہ آج نہیں تو کل اس کے جسم کی طرح اس کی روح میں بھی مشرقی اقدار کے کچھ پودے اگ آئیں گے۔